٥٦

شاعر

چند قلم نواز

ق گورکھپوری فیض احمد فیض

رشن چندر عصمت چغتائی

حیدہ اختر فضیل جعفری

حمد ندیم قاسمی شوکت صدیقی

ار جعفری غلام الثقلین رضوی

د علوی انور معظم

وین تناسید عطیہ پروین

1.2

اُردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب

شاہکار

نمبر ۵۶

مجلس مشاورت

سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمٰن اعظمی
مظفر شاہجہاں پوری
جیلانی بانو

مُدیر ـــ
محمود احمد ہنر

معاون ـــ
انتخاب سید

قیمت
۱/۲۵

سالانہ
بارہ روپے

اگست ۱۹۶۸ء

دفتر شاہکار، ۱۳۴، بخشی بازار، الہ آباد۔۳

لکھنؤ آفس۔ سروری منزل، کچّا احاطہ، لکھنؤ

بمبئی آفس۔ ڈائمنڈ لاج، سکندر پیر خاں اسٹریٹ، بمبئی ۸۔ فون نمبر ۲۷۷۹۶۵

افسانے

نظمیں

مضمون

غزلیں

طنز و مزاح

تبصرے

د احمد تنہا ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرس میں چھپوا کر دفتر رسالہ شاہکار ۳۴ بخشی بازار الہ آباد سے شائع کیا

اپنی بات

ناولٹ نمبر ہماری توقعات کے مطابق نہ صرف اہل قلم حضرات نے بلکہ قارئین نے بھی پسند کیا۔ کافی تعریفی خطوط بھی موصول ہوئے لیکن ہم ان صفحات میں قارئین کے لئے کوئی اچھی تخلیق پیش کرنے کے ہمیشہ قائل رہے ہیں، اس لئے ان خطوط کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ان کی اشاعت سے معذور رہے۔

اب تک شاہکار کا ڈاکخانہ سے رجسٹرڈ نہ ہونا ہمارے لئے کوئی تکلیف دہ بات نہ تھی لیکن ۱۵ مئی سے محصول ڈاک میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا اس کے بعد ہمارے لئے رجسٹرڈ نمبر حاصل کرنا بیحد ضروری ہو گیا۔ موجودہ نمبر اسی لئے تیار ہونے کے باوجود شائع نہ کر سکے۔

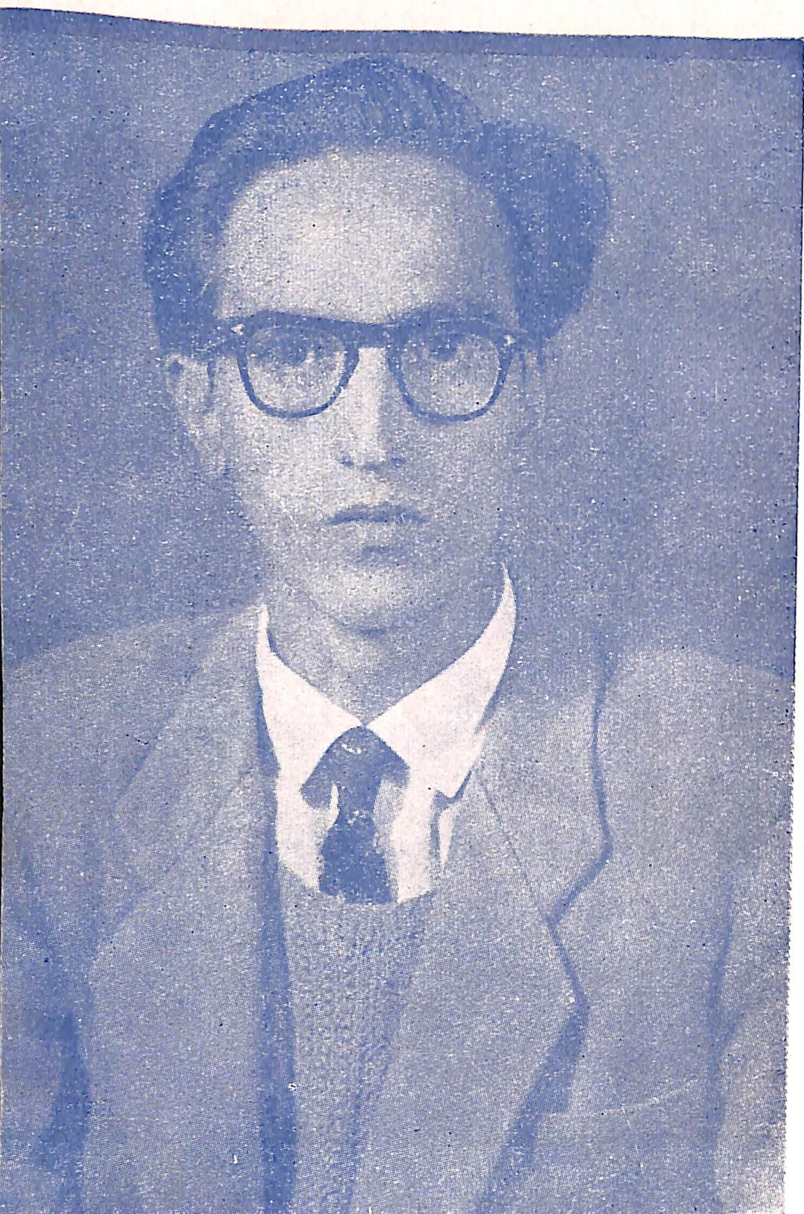
ہمارے اعلان کے مطابق اب تک شاہکار کا احتشام حسین نمبر شائع ہو جانا چاہئے تھا لیکن چونکہ اس نمبر میں غیر مطبوعہ مضامین بھی شامل ہوں گے اور ہمارے مضمون نگار حضرات دو ایک بار کی درخواست کو نظر انداز کر دینے کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے اب ہم احتشام حسین نمبر آئندہ سال ہی پیش کر سکیں گے جن حضرات نے اس خصوصی نمبر میں لکھنے کا وعدہ فرما لیا ہے ان سے درخواست ہے کہ جلد از جلد اپنی نگارشات ارسال فرما دیں۔

پرویز شاہدی کا غم ہی ہمارے لئے کیا کم تھا کہ ڈاکٹر شفا گوالیاری کے انتقال نے ہمارے دل دماغ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا۔ پرویز شاہدی سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات بمبئی کی تاریخی ترقی پسند کانفرنس (بھیونڈی) میں ہوئی تھی اور پھر تقریباً دس سال بعد کلکتہ میں لیکن دوسری ملاقات پر مرحوم جس جوش و محبت سے ملے تھے اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ہماری یہ ملاقات ایک عرصہ بعد ہو رہی ہے۔ پرویز شاہدی کی شاعرانہ عظمت کو ان کی انسانیت نے اور دوبالا کر دیا تھا۔

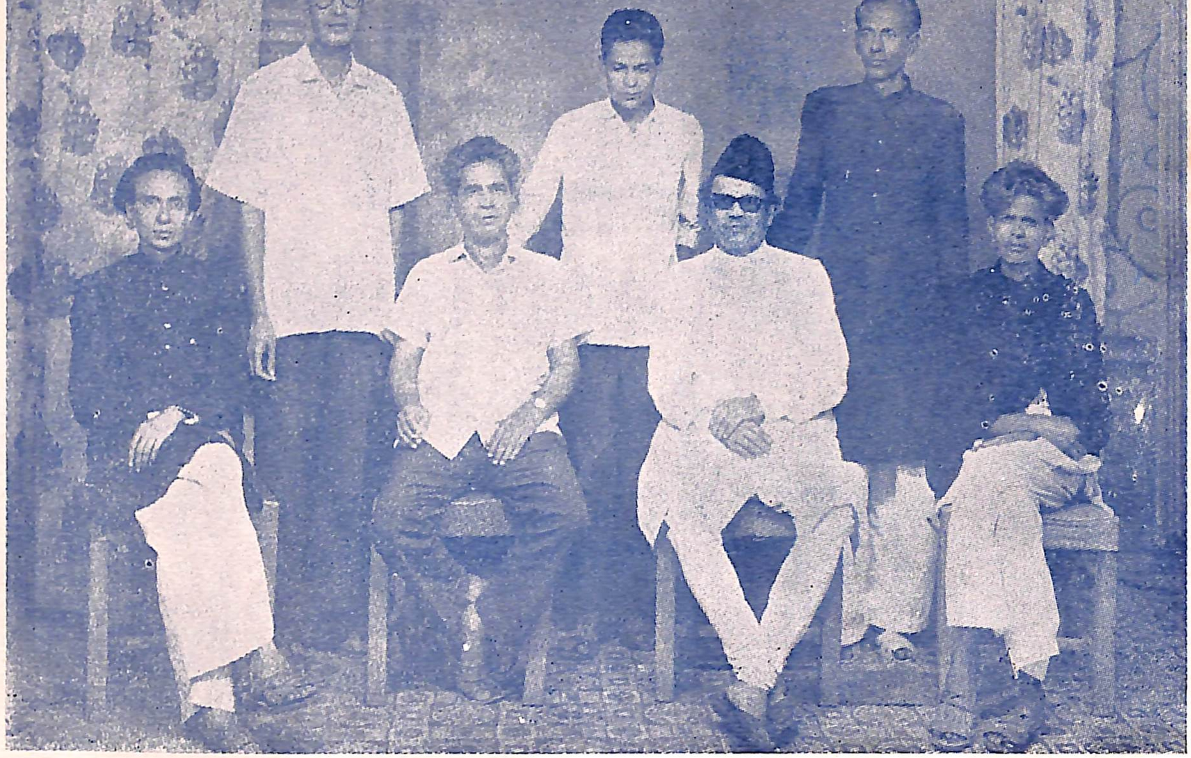
ڈاکٹر شفا گوالیاری کے انتقال کی خبر ذاتی طور پر اس لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی کہ مرحوم ادھر ملاقات کے بیحد خواہاں تھے اور راقم الحروف خود بھی بھوپال جانے کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن موت نے ہماری خواہشوں کو بیرحمی سے کچل ڈالا۔ مرحوم شفا گوالیاری نے اپنی زندگی میں جس خلوص اور محبت سے شاہکار کی اعانت فرمائی اور جس جذبے کے تحت اپنے شاگردوں کو آمادہ کیا وہ شاہکار کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اردو سے مرحوم کو بے پناہ محبت تھی اور غیر اردو داں علاقوں میں بھی شعر و شاعری کی شمع روشن کر کے انھوں نے اردو کی عظیم خدمت انجام دی ہے۔

ادارہ شاہکار مرحومین کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مغفرت کے لئے دعا گو۔

محمود احمد ہنر



وحید اختر



علاء الدین صابر، طالب رزاقی، سلیمان خطیب، نذیر اختر، مظفر شاہجہانپوری، عاتق شاہ، محمود عشقی

کرشن چندر۔ ایم۔ اے

دوشنا

ایک دن من موہن سنگھ ہمیں لندن کی "ہیرا منڈی" دکھانے لے چلا۔

ایک بیس مینٹ (Base ment) میں سے گزار کر ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔ دو تین غلام گردشوں میں چلتے ہوئے کبھی چند زینے اور چڑھتے ہوئے ہم لندن کی "ہیرا منڈی" میں پہنچے۔ جو پھر ایک بیس مینٹ میں واقع تھی اور میرے خیال میں اسی بلڈنگ میں تھی۔ یہ آنکھوں میں پٹی باندھنا اور بھول بھلیوں میں سے گزارنا محض ایک سسنی کے خاطر تھا یا آتشِ شوق کو ہوا دینے کے لئے یا الف لیلوی ماحول پیدا کرنے کے لئے۔ یہ چکر بازی پولیس سے بچنے کے لئے نہیں تھی۔ لندن کی پولیس کسی طرح ہمارے ملک کی پولیس سے مختلف نہیں ہے۔ اس دنیا کا کون سا ایسا قحبہ خانہ ہے جو پولیس کی نگاہوں سے بچا ہوا ہے۔ پولیس کے مصلحت آمیز گریز کے بغیر اس طرح کا کاروبار کہیں بھی چل ہی نہیں سکتا۔

"ہیروں"، کی اس منڈی میں ایک دوسرے سے ملحق چھ کمرے تھے اور ان میں چھ کوٹھے والیاں تھیں اور ان کمروں کے باہر ایک نیم دائرے کی صورت میں ایک چھتا ہوا برآمدہ گھومتا تھا۔ جس میں جا بجا چوبی ستون کھڑے تھے۔ ایک پھول ہار گجرے والا، ایک عطر والا اور ایک پان والا بھی ــــ یہ سبھی اس برآمدے میں اپنی اپنی دوکان سجائے بیٹھے تھے۔ کسی چھوٹے سے فلمی سیٹ

کی طرح اس چھوٹی سی جگہ میں ایک ہندوستانی قحبہ بازار کا لندنی نقشہ پیش کرنے کی پرکشش کوشش کی گئی تھی اور تجارتی اعتبار سے کامیاب بھی تھی۔ منموہن نے مجھے بتایا کہ اس کاروبار کو عبدالعزیز اور منسارام سانڈے والا مل کر چلاتے ہیں۔ عبدالعزیز پاکستان کا رہنے والا تھا اور منسارام ہندوستان کا۔ اور بڑے مزے کی بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا اشتراک عمل کہیں پر کسی مسئلے پر نظر نہیں آتا تھا اور یہ اشتراک عمل اگر کہیں پر ممکن ہوا تھا۔ تو صرف طوائفیت کے مسئلے پر۔ اسی سے آپ دونوں ملکوں کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔۔۔ منموہن سنگھ نے بہت تلخی سے مجھ سے کہا۔ میں اُسے ایک سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ میری نظر چار نمبر کے کمرے کے اندر جو پڑی تو میں اُس کوٹھے والی کو پہچان کر اندر چلا گیا۔

چند لمحے تو ہم دونوں حیرت میں ڈوبے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ کوٹھے والی اپنے سامنے رکھے ہوئے ستار کو پرے سرکا کر اپنی جگہ سے اُٹھی اور بھاگ کر میری طرف بڑھی اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ اتنے زور زور سے کہ سب لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

یہ درشنا تھی ۔۔۔۔ میری ۔۔۔ کالج کے زمانے کی محبوبہ! میرا مطلب ہے وہ میری محبوبہ تھی۔ میں اس کا محبوب نہیں تھا۔ کیونکہ میں ایک غریب متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ تھی تو درشنا بھی ایسی ہی۔ اس کا باپ ایک معمولی وکیل تھا۔ لیکن درشنا خوبصورت تھی۔ اس لئے وہ بہت اونچا اُڑنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ مجھے کبھی پسند نہ کر سکتی تھی۔ پسند تو میں بھی اُسے نہ کرتا۔ لیکن وہ زمانہ ایسا تھا جب مجھے لمبے قد کی چوڑی چکلی ہنس مکھ لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ ایسی لڑکیاں جو مجھ سے تن و توش میں کم سے کم دگنی ہوں۔ ایسا کیوں تھا کالج کے زمانے میں اور اب ایسا کیوں نہیں ہے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان دنوں کالج کے کچے زمانے میں ایسی ہی لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ میں دل و جان سے درشنا پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ لیکن درشنا نے میرے پیار کو ٹھکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تو اسی لڑکے سے محبت کر سکتی ہے، جو اسے لندن لے جائے

نہ جانے کیوں بچپن ہی سے درشنا کے دل میں لندن جانے کی تمنا تھی اور وہ ہمیشہ لندن کے خواب دیکھا کرتی تھی اور میں اُسے لندن تو کجا لنڈی کوتل تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس لیے محبت کے بازار میں میری مساعی مشکور نہ ہو سکیں۔ وہ اپنے قد میں مجھ سے تین انچ اونچی تھی۔ اس لیے اس کے دیکھنے کی سطح بھی مجھ سے اونچی تھی۔ وہ ٹینس کی بہت اچھی کھلاڑی تھی۔ ہمارا کالج اس کا ٹش نریوں کا کالج تھا۔ درشنا کا اونچا لمبا قد، اس کی بے باک ہنسی، مغربی عورتوں کی طرح اس کا تیز تیز چلنے کا انداز، گورا رنگ اور مضبوط بدن اُسے "آوٹ ڈور گرل" کی تمام صفات سے متصف کرتا ہے اور اس زمانے میں ایک "آوٹ ڈور گرل" میرے نزدیک اعلیٰ حسن کا معیار تھی۔ درشنا نے کبھی میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تھا۔ کبھی اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ دیا۔ کبھی اپنے سر کو میرے کندھے پر نہیں رکھا۔ وہ میرے ساتھ کبھی سینما نہیں گئی۔ کبھی اُس نے مجھے اپنا ہاتھ تک چومنے نہ دیا۔ کبھی اپنی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہ دی۔ کیوں کہ وہ لندن جانا چاہتی تھی۔ اور میں اُسے لندن نہیں لے جا سکتا تھا۔

جن دنوں یونیورسٹی کا میڈل جیتا تھا اور یونیورسٹی کی ساری لڑکیوں میں ٹینس کے سنگل میچ میں اوّل آئی تھی۔ ان دنوں ہمارے کالج میں پروفیسر میک فرسن صاحب نے درشنا کو چند ماہ کے لیے کالج کے خرچ پر ٹینس کے سلسلے میں مزید تربیت حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ شاید ان دنوں درشنا چلی بھی جاتی۔ اس نے نئے کپڑے سلوا بھی لیے تھے پاسپورٹ بنوا لیا تھا۔ گھر والوں سے اجازت لے لی تھی۔ لیکن عین وقت پر نہ جانے کیا ہوا درشنا کی جگہ مس روبی رام لعل چلی گئی۔ روبی ایک کرسچن لڑکی تھی اور ٹینس کے کھیل میں درشنا کے بعد دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ عین موقعے پر پروفیسر میک فرسن نے درشنا کے سامنے ایک ایسی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ جسے درشنا پورا نہ کر سکی۔ لیکن جسے روبی نے پورا کر دیا۔ اس لیے روبی چلی گئی اور درشنا رہ گئی۔ لیکن اس بات کی تصدیق کبھی درشنا سے نہ ہو سکی۔ اصل واقعہ کیا تھا، درشنا نے مجھے کبھی نہ بتایا۔ اس کے لندن نہ جانے پر میں نے طنز

کیا تھا تو وہ دانت پیس کر بولی تھی ــ "دیکھ لینا میں ایک دن لندن ضرور جاؤں گی!" اس پر میں دیر تک ہنستا رہا اور وہ غصے سے ہونٹ چباتی رہی ۔

دوسرے سال درشنا نے مشن کالج چھوڑ کر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں پر اس کی دوستی انگریزی پڑھانے والے لیکچرر نوبت رام سے ہوگئی ۔ نوبت رام کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا تھا اور اب وہ ہندوستانی سول سروس میں آنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ وہ درشنا پر بُری طرح فریفتہ ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے جتنے چپو، دبّو، کمزور طبیعت کے، لیکن علم وفضل میں اعلیٰ معیار رکھنے والے نوجوان ہوتے ہیں، اُنھیں درشنا ایسی لڑکیاں بہت بھاتی ہیں ۔ نوبت رام گھر کا امیر نہ تھا، لیکن ذہین ایسا تھا کہ اس کا سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا ۔ درشنا نے بہت سوچ سمجھ کے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا ۔ جب نوبت رام ہندوستانی سول سروس کے مقابلے پہ بیٹھا تو دوسرے نمبر پر امتیازی شان سے کامیاب ہوا۔ لیکن سول سرجن نے میڈیکل رپورٹ اُس کے خلاف دی ۔ اس لئے بے چارہ نوبت رام ایک طرف سول سروس، دوسری طرف درشنا سے شادی کرنے میں ناکام رہا ۔ اُسی زمانے میں ایک دن درشنا مجھے ایکسلسیر تھیٹر کے لاؤنج میں مل گئی ۔ وہ پکچر دیکھ کے نکل رہی تھی اور میں پکچر دیکھنے جا رہا تھا ۔ چند لمحوں کے لئے ہم دونوں ملے تھے ۔ میرا خیال ہے وہ میری طنزیہ نگاہوں کی تاب نہ لا کر دوسری طرف مُڑ گئی تھی اور مجھ سے کوئی بات کہے بغیر ہجوم میں غائب ہو گئی تھی ۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو جھینپ کا رنگ آیا تھا اُسے میں کبھی نہیں بھول سکتا ۔

پھر بہت سے سال گزر گئے اور میں درشنا کو بھول گیا ۔ کون کسے ہمیشہ یاد رکھتا ہے ۔ اگر خدا نے انسان کو بھولنے کی قوت نہ دی ہوتی تو زندگی ہر لحظہ اس کے لئے عذاب بن جاتی اسی لئے یہ قوتِ انتخاب انسان کو مل گئی ہے کہ وہ چند چیزیں ہمیشہ کے لئے بھلا دے اور کچھ چیزیں یاد رکھ لے ۔ جب تک یاد رکھنا اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے اور جب ضروری نہ رہے تو اُنھیں بھی بھلا دے اور اگر پھر کسی وقت وہ امر ضروری ہو جائے تو پھر بھولی ہوئی چیز یاد

آجائے ۔ یاد کا عمل بھی انسانی زندگی کے مسلسل عمل کے تابع ہے ۔ اس لئے جو میں سمجھتا تھا کہ درشنا میری زندگی کی سب سے بڑی چوٹ ہے ۔ جسے میں کبھی بھی نہ بھول سکوں گا ۔ چند ہی سالوں میں درشنا کو اس طرح بھول گیا ، جیسے وہ کبھی میری زندگی میں آہی نہ تھی ۔

پھر ایک دن میں نے اُسے بہت سالوں بعد اپنے دوست جیٹھائی کے کیبن میں دیکھا جیٹھائی ایک مشہور بزنس مین تھا اور درشنا اس کی سٹینو تھی ۔ پرسنل سٹینو ! مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں پہچان کی ایک چمک نمودار ہوئی تھی لیکن پھر دوسرے لمحے ہی بجھ گئی ۔ اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ہلکی سی تلخی آچلی ہے اور جب اس نے مجھے نہیں پہچانا تو میں اُسے پہچاننے والا کون ہوتا ہوں ۔ اس لئے میں نے بھی اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اس طرح زندگی میں ہم دونوں پہلی بار اجنبیوں کی طرح سے ملے اور اُسے دیکھ کر پہلی بار دل میرا اس کے لئے نہیں دھڑکا ——— وہ دل جو کبھی اس کے قدموں کی چاپ سُن کر تیز تیز دھڑکنے لگتا تھا ——— اب میری پسند دوسری تھی اور دوسری طرح کی اور اسے دیکھ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیوں اور کیسے اس طرح کی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوا تھا ۔ مجھے معلوم ہوا کہ انسان کی محبت بھی اس کی سوجھ بوجھ ۔ اس کی ذہنی سطح اور زندگی کے تجربے سے عاری نہیں ہوتی اور اگر زندگی کے کسی مرحلے پر اس کی یہ سوجھ بوجھ ۔ ذہنی سطح اور تجربے کے انداز بدل جائیں تو اس کی محبت بھی بدل جاتی ہے ۔ بہت حیرت ہوئی یہ سوچ کر کہ محبت بھی کوئی اُلوہی چیز نہیں ہے ۔ ایک زمینی جاندار مخلوق ہے جو بدل سکتی ہے ، جسے زخمی کیا جا سکتا ہے ۔ بُھلایا بھی جا سکتا ہے ۔ جس پر فخر بھی کیا جا سکتا ہے ۔ محبت ایک ذی روح شئے ہے اور جانداروں کے سارے قوانین اس پر عائد ہوتے ہیں ۔

میں جیٹھائی کے یہاں اس سے ایک سفارشی خط لینے آیا تھا ۔ جیٹھائی نے درشنا کو بلا کر وہ خط اُسے ٹائپ کرنے کو دیا ۔ درشنا وہ خط ٹائپ کر کے لائی ۔ جیٹھائی نے دستخط کئے ۔ دستخط کرتے وقت میں نے دیکھا ۔ ایک خاموش سمجھوتہ ان دونوں کے درمیان ہے ۔ بظاہر وہ

مالک تھا اور وہ ملازم تھی اور بظاہر میرے سامنے وہ دونوں انتہائی ضبط اور سلیقہ شعاری کا ثبوت دے رہے تھے۔ لیکن میں نے دیکھ لیا اور سمجھ گیا کہ یہ رشتہ کس طرح کا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ جیٹھائی کے چہرے کی مالکانہ رعونت اور رعونت کے ساتھ ساتھ ایک شفیق لیکن بالائی شفقت کا احساس خفی رعونت کے ساتھ کہ ہاں تم تو ہو۔ لیکن ہم جو ہیں سو تم سے ذرا بلند ہیں اور جو سلوک ہم تم سے کرتے ہیں، اس میں ہماری محبت کے علاوہ ہماری مہربانی کا بھی دخل ہے۔ محبت اس رشتے میں تو یوں ہی داخل ہوتی ہے۔ ایک اسٹینو کی طرح ہاتھ میں کنٹریکٹ کا کاغذ لیئے ہوئے۔ جس پر کئی شرطیں ٹائپ شدہ ہیں۔ اگر تم یہ تو میں وہ ____ اگر تم یوں تو میں ووں ____ اور اگر یوں نہ ہو سکا تو ____ ووں بھی نہ ہو گا ____ اور اگر ہو گیا تو ____ یہ بھی ہو جائے گا۔ ورنہ ____ آخر میں تصدیق کرتی ہوں ____ کہ مجھے یہ شرط منظور ہیں۔ (درشنا)..... اُدھر دستخط جیٹھائی کے اور یہ محبت کا پرزہ۔ ذہن کے صفحے پر لکھا ہوا۔ ٹائپ کیا ہوا ہر محبت نامے پر موجود رہتا ہے۔ غیر مشروط محبت کس نے کی ہے اور اگر کسی نے کی ہے تو نباہی نہیں۔ ناممکن ____ ناممکن ____!

درشنا کی کھلی بے باک ہنسی غائب تھی اور نگاہیں بھی نیچی تھیں اور چہرے پر وہ تلخی تھی، جو چند بے صبر تجربوں کے بعد آتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ٹوٹی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسے اعتماد کی جھلک تھی جسے چند ناکامیوں نے اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ اس کے جسم سے دلربائی سے کنوارا پن کا الھڑ پن غائب ہو گیا تھا۔ دیکھنے میں اب بھی وہ کنواری معلوم ہوتی تھی، لیکن کسی قدر رم دآشنا۔ جیٹھائی نے اس خط پر دستخط کر مجھے پڑھنے کو دیا۔ میں نے پڑھ کے اُسے واپس کر دیا "ہاں یہ ٹھیک ہے"۔ تو جیٹھائی نے وہی خط درشنا کو دے کر کہا: "اسے لفافے میں ڈال کر لفافے پر پتہ لکھ کر صاحب کو دے دو"۔ درشنا خط لے کر چلی گئی۔ چند منٹ کے واپس آ گئی۔ اس نے ٹائپ شدہ لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لے کر جیب میں ڈال لیا۔ گھر آ کر خط دوبارہ پڑھنے کے لئے میں نے جب لفافہ کھولا تو اس سفارشی خط کے ساتھ درشنا کا بھی ایک خط تھا

جس پر جلی ٹائپ میں صرف اتنا لکھا تھا
____

"میں لندن ضرور جاؤں گی "

درشنا

خط پڑھ کر میں مسکرا دیا۔ وہ لندن جائے نہ جائے۔ اب مجھے اس سے کیا۔ پھر یہ خیال آیا کہیں پر اس کی روح کے اندر میری وہ طنزیہ ہنسی اور نگاہ پھنسی ہوئی ہے۔ مچھلی کے کانٹے کی طرح اور درشنا بالکل بے بس ہے۔ وہ اس کانٹے سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

مکتی حاصل کرنے کے بھی کئی طریقے ہیں اور مردوں اور عورتوں نے گزشتہ ہزاروں برسوں میں زندہ رہنا تو سیکھا نہیں پوری طرح ہے ۔ ہاں مکتی حاصل کرنے کے لئے کئی طریقے ایجاد ہیں۔ چنڈوپی کر۔ چالیس دن کا چلہ کھینچ کر۔ پارلیمنٹ میں لگاتار پندرہ دن تک بول کر یا زندگی بھر نہ بول کر، کانٹوں پر سو کر یا ٹوئسٹ ناچ کر یا چھ ماہ ایک ٹب میں نہائے بغیر پڑے رہ کر اس دنیا میں مکتی حاصل کرنے کے اتنے ہی طریقے ہیں، جتنے لوگ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا لوگ زندہ ہو کر زندگی کو بہتر بنانے کی بجائے زندگی سے مکتی پانے کی کیوں سوچتے ہیں۔ مکتی پا کر انھیں کیا مل جائے گا۔ نیکی بدی، عذاب و ثواب، سزا و جزا کی دلکش شخصیت سے اُٹھ کر مکتی کے اُس خلائی ماحول میں اُنھیں کیا مل جائے گا۔ جہاں کسی لذّت کا وجود نہیں، کسی گناہ کا ثبوت نہیں، کسی نیکی کی لطافت نہیں، کسی سزا کی ہلاکت نہیں، جہاں کسی تخلیق کا درد نہیں، کسی چاہت کی مسرّت نہیں، کسی کاوش کا جمال نہیں، کسی ناکامی کا ملال نہیں ۔۔۔ نہ جانے آدمی آدمی ہو کر پتھر بن جانے کی خواہش کیوں رکھتا ہے ۔۔۔ ؟ لیکن درشنا کی خواہش تو ایسی کوئی خواہش نہیں۔ وہ تو لندن جانا چاہتی ہے۔ جیسے کوئی ماونٹ ایورسٹ پر چڑھنا چاہتی ہے۔ اور کوئی چاند پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اس میں کیا بُرائی ہے جناب ؟ اور آپ شاید اس لئے جل رہے ہیں کہ یہاں پر آپ کا واسطہ ایک ایسی لڑکی سے پڑا ہے، جو اپنے عزائم کے تکمیل کیلئے آپ کی محبت کو بھی ٹھکرا سکتی ہے اور تم اس کے ٹھکرانے کو کبھی بھلا نہ سکے۔ اسی لئے تو کبھی طنزیہ قہقہے لگاتے ہو۔ کبھی شرر بار نگاہوں سے اُسے گھورتے ہو، کبھی بالکل اجنبی ہو کر اس سے مخاطب

ہوتے ہو۔ ایک خاموش جنگ ہے۔ جو اس کے اور تمہارے درمیان چل رہی ہے۔ اس کے بجائے کہ تم اس کے عزم کی داد دو، تم اس کے استوار وعدے سے ہراساں ہو، جو اس نے اپنی شخصیت سے کیا ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی میں کچھ وعدے کرتا ہے اپنے آپ سے اور پھر ساری زندگی ان کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ ایک سیدھی لکیر کی طرح نہیں بلکہ زندگی کے طویل تر پُرپیچ ٹیڑھی میڑھی لکیر کی طرح مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی۔ بظاہر بالکل بے معنی اور بے مقصد نظر آتے ہوئے بھی اپنے اندر کسی مخفی خواہش یا خواب کا اہتمام کرتی ہے۔ کسی بھی آدمی کو اس کی ناکامی یا کامیابی سے نہ پہچاننا چاہیئے۔ صرف اس کے خوابوں سے پہچاننا چاہیئے۔

" MEANS اور ENDS کی اس بحث میں تم کہاں پر ہو درشنا ؟"

میں نے بہت دیر باتیں کرنے کے بعد اس سے سوال کیا۔ " اب جب کہ تم اپنی زندگی کی منزل پا چکی ہو، یعنی لندن پہنچ گئی ہو۔ لیکن ایک طوائف بن کر! تم نے کبھی یہ تو سوچا ہوگا کہ تمہیں اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے کتنی بڑی قیمت دینا پڑی ہے ؟ "

" میں نے کبھی قیمت کا اندازہ نہیں کیا تھا " درشنا نے سوچ سوچ کر کہا۔

" کم از کم پہلے دنوں میں نہیں کیا تھا۔ جب میں یہاں پہنچی تھی تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی چاند پر پہنچ جائے۔"

" میں سمجھ سکتا ہوں۔"

حالانکہ لندن نے بہت سے کنویں جھنکوا دیئے مجھ سے۔ جیٹھا ئی کو تم ملے تھے۔ وہ تمہارا دوست تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لندن لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن راستے میں طہران ہی میں اس نے مجھے اُتار دیا اور خود اکیلا ہی ہو آیا اور پھر واپسی میں اس نے مجھے طہران سے لے لیا۔ دو اور تاجروں نے مجھے سٹینو رکھا اور لندن لے جانے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ میں تو لندن پہنچنے کے لئے بیتاب تھی اور ہر ناکامی میری روح میں اپنی منزل تک پہنچنے کی ناقابل بیان

تڑپ پیدا کر دیتی تھی۔ ان دنوں مجھے محسوس ہوتا تھا، لندن پہنچنے کی کوئی بھی قیمت ہو کم ہے۔ میں پھر ان تاجروں کی باتوں میں آگئی لیکن وہ دونوں مجھے بمبئی سے آگے کہیں نہ لے گئے۔

"پھر میں ایک سمگلر کے ہتھے چڑھ گئی۔ آنکھیں بند کر کے نہیں، جان بوجھ کر اور وہ مجھے لندن لے آیا! لیکن لندن لانے سے پہلے اس نے میرا خوب خوب امتحان لیا۔ مجھے تین سال گجرات کچھ اور راجستھان کے بارڈر پر سمگلر کا کام کرنا پڑا اور بمبئی میں بھی اور اگر میں تمہیں وہ سب واقعات سناؤں اور اگر ثابت ہو جائیں تو مجھے اتنا عرصہ جیل میں رہنا پڑے کہ میری وہ زندگی اس کے لئے کم ثابت ہو — لیکن میں نے بالکل پروا نہیں کی۔ میں لندن پہنچنے کے لئے اتنی بیتاب تھی کہ ہر بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔ اس کا بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔"

"پھر تم حالت تک کیسے پہنچیں؟"

"اُس سمگلر کو یکایک لندن سے بھاگنا پڑا۔ پولیس اس کے پیچھے تھی وقت اتنا کم تھا کہ وہ مجھے اطلاع نہ کر سکا۔ اس میں اس کا بھی کچھ قصور نہیں۔ ہوٹل کا بل ادا نہ ہوا تھا اور میں لندن میں اس کے سوا کسی اور کو پہچانتی بھی نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا تھا — مجھے گریٹ رسل میں رکھا تھا۔ اپنی شرافت جتانے کے لئے، اس کے یکایک بھاگ جانے پر میں بہت پریشان ہو گئی۔ چند دن اسی انتظار میں گزرے کہ مجھے وہ اطلاع دینے کی کوشش کرے گا۔ لیکن جب اخباروں میں خبر آگئی کہ پولیس نے اُسے ہانولولو میں گرفتار کر لیا ہے، تو ہوٹل والے میرے سر ہو گئے کہ بل ادا کرو میں کہاں سے ادا کرتی؟ ہوٹل والوں نے مجھے پولیس میں دینے کی دھمکی دی۔ بھلا ہو میرا کمرہ دیکھنے والے ویٹر کا۔ اس نے مجھے راہ سجھائی کہ میں اگر بُرے راستے پر لگ جاؤں یعنی ٹھیک راستے پر لگ جاؤں تو میں مستقل طور پر اس ہوٹل میں قیام کر سکتی ہوں اور میرے ہوٹل کا بل بھی ادا ہو جائے گا۔ اور لندن میں میرے مستقل قیام کا بندوبست بھی ہو جائے گا — اُس وقت میں کیا کرتی؟ ناچار میں نے منظور کر لیا اور گریٹ رسل میں — گویا لندن کے دل میں — ہوٹل کے مخصوص اور امیر ترین گاہکوں کی دلداری کے لئے رہنے لگی۔ اس زندگی کی طرف یہ میرا دوسرا قدم تھا پہلا قدم

تو میں ہندوستان میں اُٹھا چکی تھی۔ گریٹ رسل سے اس انڈیا آفس میں آنا کوئی بہت زیادہ حیرت خیز بات تو نہیں ہے۔ جس پر تم یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے ہو۔ دیکھو میں آخر لندن پہنچ گئی! اور میں نے اپنا وعدہ تم سے پورا کر دیا۔" اور وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"اور اب کیا سوچتی ہو؟"

"اب میں سوچتی ہوں ــ اگر میں نے شروع ہی میں تمہارا کہا مان کر تم سے شادی کر لی ہوتی تو اچھا ہوتا ــ کہیں اچھا ہوتا۔" اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں اس کے لئے پگھلے ہوئے نرم رومانی رحم کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں پھر اُسے شادی کی دعوت دینے والا تھا کہ وہ یکایک ایک تلخ بیزار کن قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"لیکن اب کون شادی کرے گا مجھ سے ــ"

اس کا چہرہ پھیکا، تلخ، ایک زرد سی چٹان کی طرح بدنما نظر آنے لگا تھا۔ زبان جھوٹ بول سکتی ہے۔ ہونٹ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ آنکھیں جھوٹ بول سکتی ہیں۔ لیکن پورا چہرہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ درشنا لندن آنے سے پہلے اور لندن آنے کے بعد جن منزلوں سے گزری تھی، وہ ایک غبار راہ کی طرح اس کے چہرے پر بکھری پڑی تھیں۔ اب یہ کسی کی بیوی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس چہرے کی برسوں دُھلائی کرنی پڑے گی۔ دُھلائی، پونچھائی اور پالش۔ تب کہیں یہ چہرہ اس قابل ہو سکے گا کہ اس پر اس گھریلو سکون اور اطمینان کے آثار نمودار ہوں۔ جن سے اکثر گھر والیوں کے چہرے عبارت ہوتے ہیں۔ لیکن اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس؟ زندگی بہت مختصر ہے اور درشنا نے زندگی میں اتنا کوڑا کرکٹ بھر لیا ہے کہ اُسے صاف کرتے کرتے میری پوری زندگی صرف ہو جائے گی نہیں جناب! یہ رومانیت مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کہانیوں میں بہت اچھی لگتی ہے۔ اس طرح کی محبت۔ لیکن میں بیسویں صدی کا آدمی ہوں۔ جس کے عہد نے اُسے بتا دیا ہے کہ شاعروں کا چاند بھی ایک بنجر زمین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بہت جلد یہ لوگ چاند پر اُتر جائیں گے۔ پھر اس پر ہوائی اڈے قائم کریں گے۔ چاند کے ہوائی اڈوں سے کسی ملک پر کتنی آسانی سے بمباری

ہو سکتی ہے، کتنی آسانی سے راکٹ پھینکے جا سکتے ہیں اور میں لگا رہوں گا درشنا کی غلیظ زندگی دھونے میں۔ ہشت! میں کوئی دھوبی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی نوجوانی میں سچے دل سے درشنا کو ایک چانس دیا تھا اور اس دنیا میں کسی کو بس ایک ہی چانس ملتا ہے۔ اس نے اس چانس کو ٹھکرا دیا اور اب وہ لندن میں ہے اور وہ لندن آنا چاہتی تھی، تو اب وہ خوش کیوں نہیں ہے؟

جس درشنا سے میں شادی کرنا چاہتا تھا یہ وہ درشنا کبھی نہیں ہے۔ خدا جانے یہ کون ہے؟ لوگ چاند پر میٹر ایل فٹ کر رہے ہیں۔ کس کے پاس گندی زندگیاں دھونے کا وقت ہے؟ چلو اپنے پھٹے چیتھڑوں میں حشر کے میدان میں چلے چلو۔ سامنے آگے پیچھے ہر جگہ قیامت ہے اور اس زمین پر جتنے خدا ہیں سب تجربہ گر ہیں۔ پھر کون کس سے منصفی چاہے گا؟ ــــ آل رائٹ! اگر یہ سچ ہے کہ انسان اپنے خوابوں سے پہچانا جاتا ہے تو درشنا بے قصور ہے۔ اگر اس نے لندن جانے کا خواب دیکھا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اور کیا غلطی کی تھی اس نے؟ کوئی بھی پیرس، نیویارک، بمبئی، راولپنڈی، جینز ویا ٹوکیو جانے کا خواب دیکھ سکتا ہے۔ اس میں کون سی بات غلط تھی؟ ــ میں بتاتا ہوں تمہیں درشنا! تمہارا خواب بُرا نہیں تھا۔ لیکن آخر تھا کیا اس خواب میں، لندن آکر تم کیا کرنا چاہتی تھیں۔ لندن تم کیوں آنا چاہتی تھیں۔ کوئی ایک شہر دوسرے شہر سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ صرف سڑکوں پارکوں کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ بولنے والوں کے لباس اور ان کی زبان مختلف ہوتی ہے لیکن بھاؤ کرنے والوں اور خریدنے اور بکنے والوں کے ضمیر مختلف نہیں ہوتے ہر آدمی کو اپنے خواب کا مکمل تانا بانا یاد رکھنا چاہئے۔ ورنہ وہ کسی وقت بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔ کیوں کہ جس عہد میں ہم رہتے ہیں اس کا ضمیر شکستہ ہو چکا ہے۔ وہ کسی ٹیکسی کے خراب میٹر کی طرح اب چلتا نہیں ہے۔ صحیح بھاؤ نہیں بتاتا۔ ورنہ درشنا کو لندن پہنچنے کے لئے اپنا سب کچھ لٹانا نہ پڑتا ـــ گڈ بائی درشنا! میری محبوب! ایک دن تم سے ہندوستان میں ملاقات ہوگی، کسی سڑے ہوئے ہسپتال کے گندے کمرے میں یا کسی اندھی گلی کی متعفّن موری کے کنارے تم پڑی ہوگی۔ ہو سکتا ہے تم لندن ہی میں مر جاؤ اور کوئی تمہاری لاش کا دعوے دار تک نہ ملے۔ کیونکہ کسی کو فرصت نہیں ہے۔ ــ ہم چاند تک پہنچ رہے ہیں۔

••

عصمت چغتائی

نوالہ

پوری چال میں ایک ڈنڈ مچا ہوا تھا — ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی کھولی میں سانپ نکل آیا ہے۔ یا کسی کے بال بچہ ہو رہا ہے۔ عورتیں ایک کھولی سے دوسری میں گھس رہی تھیں۔ شیشیاں بوتلیں ڈبے لئے سب کی سب سرلابین کی کھولی کی طرف لپک رہی تھیں۔ جیسے سرلابین کا آخری وقت ہو اور ساری پڑوسنیں اپنی سی کرنے پر تُلی ہوں۔

ایک طرح سے تو سرلابین کا واقعی آخری وقت تھا۔

ان کی ٹرین بس چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ پورے تینتیس برس کی ہوتیں اگر ان کے دور اندیش والدین نے پربھاکر کے سارٹیفکٹ میں ان کی عمر کے پورے پانچ سال نہ ہڑپ کر لئے ہوتے۔

مگر کاغذ کی عمر ایسا زبردست سہارا نہیں ہوتی۔

وہ یوپی کے کسی گم نام سے گاؤں کی پیداوار تھیں۔ مگر بمبئی میں اتنے سال رہیں کہ وطن کو بھول بھال کے بمبئی کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔ اُن پر کسی صوبے کا ٹھپّا نہیں تھا۔ کوئی اُنھیں گجراتی سمجھتا، کوئی مارواڑی اور سندھی، بس جگت سرلابین ہو گئی تھیں۔

سرلابین کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل میں نرس تھیں۔ مہنگائی الاؤنس ملا کے دو سو چالیس روپے ملتے تھے۔ بارہ روپے کمرہ کا کرایہ دے کر اتنا بچ جاتا تھا کہ بڑے ٹھاٹھ سے رہتی تھیں۔ ہاسپٹل سے مرہم پٹّی کا سامان، اے۔ پی۔ سی کی گولیاں، مرکیوری کروم، اصلی گلیسرین اور پیٹنٹ دواؤں کے

بیمپل لاکر مفت تقسیم کیا کرتی تھیں۔ ان کا کمرہ آس پاس کے علاقے کے لئے اچھا بھلا ہسپتال تھا۔ سرلا بین بڑے کام کی چیز تھیں۔ اوپر سے شکل صورت کے ساتھ ساتھ چال چلن ایسا تھا کہ کبھی کسی کی گرہستی پر شبے پڑنے کا خدشہ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بڑے انتہا ہر دل عزیز تھیں۔ جدھر نکل جاتیں ان کے جنائے ہوئے بچے کلبلاتے روتے بسورتے نظر آتے۔ لوگ ان کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے۔ ہر سودے والا ہر دوکاندار انھیں رعایت سے مال دیتا۔ وہ مول تول کرتی جاتیں اور مریضوں کے حال چال بھی پوچھتی جاتیں۔

”کیوں رے تلسی، بہو کی کمر کا درد کیسا ہے۔ ارے شاکر میاں آمنہ بی کے پیروں کی سوجن اتری کہ نہیں۔ شام کو لے آنا۔ انجکشن دے دوں گی۔ ارے او رجبی تیرے گھٹنوں کے درد کا کیا ہوا؟ تیرا مرد پھر دارو پی کر آنے لگا ہے۔۔“

وہ خیر خبر پوچھتی، گام دیوی کے نکڑ والے بس اسٹاپ پر پہنچ جاتیں اور ان کے مریض ان کو دعائیں دیتے رہ جاتے۔

بس سب کو یہی دکھ تھا کہ سرلا بین اب تک کنواری بیٹھی تھیں۔ اگر شادی کے بعد وہ بیوہ ہو گئی ہوتیں یا میاں چھوڑ کر چلا جاتا تو بھی صبر آجاتا، مگر یہ تو نرا اندھیر تھا کہ ان کی ریل چھوٹ رہی تھی اور جیون ساتھی کا دور دور نشان نہ تھا۔ سب کے سر ان کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے لئے کرتی تھیں، لیکن ان کے لئے کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ یہ شہر بمبئی ہے۔ یہاں زندگی سرپٹ دوڑتی ہے۔ یہاں مشاطہ اور نائن کا فیشن ختم ہو چکا ہے۔ یہاں تو بس آنکھ لڑ جاتی ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔

سرلا بین فلم ہیروئن نہ سہی، ڈراونی بھی نہ تھیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ان پر عاشق ہی نہ ہو پائے۔ آدمی کا بچہ تھیں۔ باپ بچپن ہی میں مر گئے۔ ماں ہمیشہ کی روگی۔ سنگر مشین کے بل بوتے پر انھیں پالتی رہیں۔ پھر جب بیٹی کمانے لگی تو وہ بالکل ہی ٹوٹ گئیں۔ دو ایک بار اچٹتا ہوا انھیں اپنی بیٹی کے بیاہ کا خیال آیا۔ مگر اس خیال کے کوئی معقول صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی وہ چل بسیں۔ وہ دن اور آج کا دن سرلا بین ایسی لپٹے کام میں جٹیں کہ شادی کا خیال تک نہ آیا۔ خیال آیا بھی ہوگا تو انھوں نے کسی سے تقاضا نہیں کیا۔ اور تھا بھی کون جس سے تقاضا کرتیں کہ بھئی ہمارا بیاہ کرا دو؟

کہتے ہیں اگر کوئی کنواری کنیا بیٹھی رہے تو دھرتی کی چھاتی پر بوجھ ہوتا ہے اور دھرتی کے اس کرب کا پاپ سب کو لگتا ہے۔ کم از کم سرلا بین کے جاں نثاروں کا تو یہی عقیدہ تھا ان کی نیکی اور پارسائی قابلِ ستائش تھی۔ مگر نیکی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی ان سے نہیں کہتا تھا کہ با با کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاؤ۔ مگر عورت کے چند گُر ہیں۔ جنھیں اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل تو بر بھا لسنا اکیلے ماں باپ کے بس کی بات بھی نہیں۔ اچھی شریف زادیاں بھی اب تو چڑیا خود ہی گھیرتی ہیں۔ پھر شرما کر سر جھکا ڈور والدین کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں۔ کوئی داغ نہیں لگتا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ والدین بھی سرخرو دولہا دلہن بھی مگن۔ یوں ہوا کرتی ہیں شادیاں۔ مگر نہیں ہو پاتیں تو بے چاری سرلا بین جیسی مسی گایوں کی۔ جو دنیا کے زخموں پر پھاہا رکھنے میں ایسی گم ہیں کہ اپنا کچھ ہوش نہیں۔ سب کے دُکھ بانٹتی ہیں، راتیں آنکھیں میں کاٹ دیتی ہیں، نوزائیدہ بچے ہتھیلیوں پہ جھیلتی ہیں —— اور پھر اپنی نیم تاریک کھولی میں اُلٹا سیدھا نگل کر سوئی کھاٹ پر پڑ جاتی ہیں، کوئی اتنا نہیں جو ان کی تنہائی کے رستے ہوئے زخموں پہ پھاہا رکھے یہ اتنا بڑا جیتا جنگھاڑتا بمبئی۔ کیا یہاں کوئی اکیلا کوئی عورت کے پیار کا بھوکا نہیں، کسی کو عورت کے لمس کی چاہت نہیں۔ سرلا بین کسی کی محتاج نہیں، اپنا کماتی کھاتی ہیں، ساری چال میں ایک نگینہ سا کمرہ ہے جو کسی فلیٹ سے کم نہیں —— صوفہ کرسی بھی ہے اپنا الگ سنڈاس بھی۔ اب اور کیا چاہیئے اس دنیا میں۔

لوگوں کا کیا ہے۔ کنوارے تو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ہر دم شادی کی دعائیں۔ شادی کے تقاضے۔ لوبھئی شادی کر لو تو بچے کی فرمائش۔ ایک بچہ ہوا تو یہ الا ہے کہ اے ہے بس ایک ہی چلیئے دوسرا پیدا کیجیئے۔ مگر سرلا بین کو بھی یقین نہ ہوا تھا کہ سدا وہ کنواری ہی رہیں گی، کوئی تو ہوگا —— اس یہاں سے وہاں تک پھیلی دنیا میں —— کوئی ایک اللہ کا بندہ جسے خدا نے ان کی زندگی کا حصہ دار بنایا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اسے ڈھونڈھ نہیں پائیں۔ لوگوں کے کہنے سے انھیں اور بھی خیال آنے لگا۔ مگر جب بھی اُنھوں نے کسی کو اس خیال سے دیکھا وہ شجر ممنوعہ ثابت ہو، اور اپنی

بیوی کی پوشیدہ بیماریوں کا رونا لے بیٹھا۔ کچھ وقت ساتھ گزارنے کو تو بہت سے نیار ملے۔ مگر ہاتھ پکڑ کے نبھانے کے خیال سے بارات لے کر چڑھنے کا ارمان کسی کے دل میں نہ جھانکا۔ ہاسٹل میں بھی کبھی کسی نے گہری گہری پُراسرار آنکھوں سے انہیں نہ دیکھا۔ کبھی کسی نے انہیں ہٹ کر راستہ دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی۔ لوگ دندناتے نکل جاتے اور وہ آڑی ہو کر دیوار سے لگ جاتیں۔

گام دیوی کے ناکے سے وہ روز صبح کو پونے آٹھ بجے والی بس پکڑا کرتی تھیں۔ بس میں سب ہی روز کے جانے پہچانے ہوا کرتے تھے۔ سب کی سیٹیں کچھ مقرر سی ہو گئی تھیں۔ اس دن وہ بے خیالی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھیں۔ ایک اجنبی کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انھوں نے لبالب بھری ہوئی بس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بس کے بیچ میں لٹکی ہوئی رکاب پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اجنبی نے انھیں سر سے پیر تک دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جائیے ——" وہ رکاب پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اخبار پڑھتا رہا۔

"انھوں نے پہلے بوکھلا کر جھٹ سے اپنا بٹوہ دبوچا کہ کہیں کوئی چور اچکّا تو نہیں۔ پھر سمجھیں کسی پیشنٹ کا شوہر ہو گا اور ابھی پیروں کے ورم کمر کے دکھ درد کا قصہ شروع کر دے گا۔ مگر وہ رکاب پکڑے کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔ جب انھیں یقین آ گیا کہ وہ خود بھی کسی مہلک مرض میں مبتلا نہیں تو وہ سناٹے میں رہ گئیں۔ ایسا تو کبھی ہوتا نہیں!

مگر دوسرے دن جب پھر وہی ہوا کہ وہ بس پر چڑھیں اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا تو وہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئیں مگر بڑی کسمسائیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں، جی چاہا اسے مٹھی بھر سلفا کی گولیاں ہی دے دیں۔ کہیں زخم تلاش کر کے مرکیوری کروم کا پھاہا رکھ کے سفید جھک سی پٹی باندھ دیں۔ مگر اس کی مکمل صحت سے ان پر اوس پڑ گئی۔ ایک کھرونچے تک کا نشان نہ تھا۔ وہ بس میں بے تعلق سا کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔ تیسرے دن جب یہی حادثہ ہوا تو سرلا بین کے چھکّے چھوٹ گئے۔

"نگوڑے کا ہے کو مجھے روز روز سیٹ دیتا ہے کیا تیرے اماں بہنیں نہیں کلموئے" ان کا جی

چاہا اسے کسی بات پہ خوب جلی کٹی سنائیں مگر وہ ایسا بے تعلق سا کھڑا جھول رہا تھا کہ انھیں بات ٹُٹے کی سی لگی۔

جب ہفتہ بھر یہی دستور چلتا رہا تو سرلا بین بالکل اُتھل پُتھل ہو گئیں۔ خدمت گزاریوں کی تو وہ عادی ہو چکی تھیں۔ کسی کا احسان اُٹھانے کی ان میں عادت نہ تھی۔ ان کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا۔ ڈیوٹی پر اُنھیں بار بار خیال آتا کہ کیا کریں۔ دوسری بس سے چلیں تو وقت پر پہنچنا ناممکن۔ سرلا بین کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ وبا سے رُوٹھی رُوٹھی رہنے لگیں جیسے کوئی اُن کے ساتھ سخت زیادتی کر رہا ہو۔ ان کا مزاج بڑا نازک ہو گیا۔ اب وہ بات بات پر اُلجھ پڑتیں۔ بے بات کے رونے لگتیں۔ ڈیوٹی سے لوٹتیں تو آنکھیں بند کر کے کھاٹ پر پڑ جاتیں نہ کھانے کی سدھ بدھ، نہ کچھ۔ کسی کو کچھ دُکھ درد بھی ہوتا تو پاس آتے ڈرتا۔

"سرلا بین کو عشق ہو گیا ہے ـــــ" ستو گرہ کٹ نے رام دئی کو بتایا

"دُر موئے، تیری کھاٹ کٹے۔ سرلا بین تو دیوی ہے دیوی ـ" رام دئی نے ستو کی سات پشتیں تو م ڈالیں۔

"میں جو کہہ رہا ہوں"

"کیا کہہ رہا ہے، تیرے منہ میں بھوبل"

جب ستو گرہ کٹ نے بتایا کہ کام دیوی کے ناکے پر اس کی بزنس ہوتی ہے۔ ہر ایک کو تولنا پرکھنا، اس کی جیب کے بوجھ کو ہلکا کرنا اس کا روز کا کام ہے۔ ایک عدد بابو روزانہ اپنی سیٹ سرلا بین کو دے دیتا ہے اور خود کھڑا سفر کرتا ہے۔ آج سے نہیں ہفتوں سے یہ قصہ چل رہا ہے اور معاملہ قطعی پلٹتا نظر آرہا ہے۔

"ہائے میں مر جاؤں!" رام دئی نے چھاتی کوٹ لی اور دوڑی ننبو کے پاس گئی۔ ننبو بھی سناٹے میں رہ گئی۔ پھر دونوں مل کر سعادت کے بہو کے یہاں گئیں۔ سعادت کی بہو منڈیر پر لونڈے کو لٹکائے اجابت کرا رہی تھیں۔

"خدا کی قدرت ہے"، لونڈا موری میں گرتے گرتے بچا۔

پھر یہ بات آگ کی طرح ساری چال میں گھوم گئی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے"، لکشمی گھاٹے نے کہا۔ وہ ریڈی میڈ کپڑوں میں کاج ٹن بناتی تھی اور
ڑی جہاں دیدہ تھی، اس کا میاں لاپتہ تھا۔ ایک لڑکی تھی وہ اس نے مشن اسکول میں دے دی
تھی۔ سب اسے گالیاں دیتے تھے کہ اس نے لونڈیا کو عیسائی بنوا دیا۔ لیکن لکشمی ایک کان سنتی تھی
دوسرے کان سے اُڑا دیتی۔ کاج بٹن سے کہیں پیٹ پلتے ہیں؟ سب جانتے تھے۔ وہ راتوں کو جایا
کرتی ہے، لالہ کے ڈر سے گاہکوں کو چال پر نہیں لاتی، نرگسی کو کیا؟ اس نے دار وپی کے کبھی لفڑا نہیں
کیا۔ جیسے آئے دن انٹری کیا کرتی تھی نام اس کا ایڈتھ تھا مگر اینٹری ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کھلے بندوں
دادر کا دھندا کرتی تھی، لالہ کو ڈٹ کر بخشش دیتی تھی۔ پولیس سے بھی ہفتہ مقرر تھا۔ کوئی اس کے مُنہ
نہیں لگتا تھا، کیونکہ وہ آئے دن دارو چڑھا کر انگریزی میں گالیاں بکا کرتی تھی کم سے کم چال والوں کا
تو یہی خیال تھا۔ کئی بار بھنور میں آچکی تھی، اور سرلا بین کی شکر گزار تھی کہ اُنھوں نے اس کی نیّا پار لگائی
تھی۔ چال میں کئی آبرو باختہ عورتیں رہتی تھیں۔ مگر کسی کو طعنے دینے اور اعتراض کرنے کی فرصت نہ
تھی۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رگ دبی تھی۔

"تو بیاہ کیا چال ہی میں رچے گا۔"

"اور کیا؟ سامنے کے میدان میں تنبو تن جائے گا۔ بمبئی میں تو بڑی بڑی شادیاں تنبو تان کے
کی جاتی ہیں۔" شبو نے فیصلہ کیا۔

"ہائے مزہ آوے گا۔ اپنی سرلا بین دولہن بنے گی۔" رام دئی کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔
وہ ہر موسم میں نئی شادی رچاتی تھی۔ کچھ دن بعد دولہا اس کی ٹھکائی کر کے کبھی کپڑے لتے تک چرا
کے بھاگ جاتا۔ ابھی پچھلی شادی تو اس نے باقاعدہ کی تھی۔ تنبو تاننے میں بہت خرچہ آتا۔ اس لئے
کھولی ہی میں پنڈت لوہے کی انگیٹھی جیا ہون لے کر آگیا اور پھیرے ڈال دیئے۔ رام دئی خوب
سج کر دولہن بنی۔ چالی پر عجیب عروسانہ موڈ چھا گیا۔ خوب سی مہندی گھول کر سب نے تھوپی۔ ٹین بجا کر

فلمی گانے گائے گئے۔ رخصتی کے وقت جو ہاتھ لگ گیا رام دئی اس سے گلے لگ لگ روئی ۔" ہائے میرا بیرن ــــ ہائے میرا بابل۔ ہائے مجھے مت اپنی ڈیوڑھی سے نکالو" وہ کسی فلمی سین کی یاد میں چنگھاڑتی رہی۔ پنواڑی نے تیز تیز آواز میں گراموفون لگا دیا "کاہے کو بیاہی بدیس"، گو نہایت سریٹ چینچیاتی آوازمیں بے حد بےسُری عورتیں گا رہی تھیں۔ مگر یہ کم بخت گیت ہی کچھ ایسا ہے کہ جی بھر آتا ہے۔ بیٹی کی رخصتی کا سماں بھی عجیب ہوتا ہے۔ حالانکہ رام دئی رخصت نہیں ہوئی۔ اس کا بھینگا دولہا بھی بیاہ کر چال ہی میں آگیا۔

کئی دن رام دئی شرمائی، لجائی پائل بجاتی پھرتی رہی۔ پھر دولہا نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ روز دارو پی کر ہڈیاں توڑتا۔ مہینے بھر کے اندر اندر وہ اس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ لے کر بھاگ گیا۔ رام دئی تھوبڑا سجائے کئی دن تک لنگڑاتی رہی اور اس کی جان کو کوستی رہی۔

ان تلخ تجربوں کے باوجود لفظ "شادی"، سے رام دئی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے۔ اپنے علاوہ کسی کی شادی ہو تو بھی مضائقہ نہیں ــ موقع خوشی کا ہے۔

ڈرتے ڈرتے سرلا بین کو چھیڑا گیا اور جب وہ ذرا جھینپ گئیں تو بس دھر لیا گیا۔

" سرلا بین بیاہ کر ڈالو ــــ "

" ہاں جی! یہی عمر ہے کھیلنے کھانے کے۔"

" تمہارے ماتا پتا کی آتما کو بھی شانتی ملے گی۔"

" ہائے رام ہم تو خوب ہلچل مچائیں گے۔"

" چوک میں تنبو تنے گا۔"

" دولہا گھوڑے پر چڑھ کر آوے گا۔"

" سرلا بین گھونگٹ کاڑھو گی؟"

" اے بھلا کیوں نہ کاڑھیں گی۔ کہیں بنا گھونگٹ کے دولہن بنی ہے۔" رام دئی نے رائے دی۔ وہ اس لائن میں ایکسپرٹ مانی جاتی تھی۔

"ہائے چال سونی ہو جائے گی۔"

"سعادت کی بہو کا بچہ کون جنائے گا؟" ہر سال سعادت کی بہو کو سرلا بین کی خدمات کی ضرورت پڑتی تھی۔

"سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا۔" سرلا بین چڑ گئیں "کس نے کہہ دیا تم سے شادی بیاہ کا؟"

اے ہے تو پھر روز بس میں سیٹ کیوں دیتے ہیں۔" شبو تنتنائی۔

"یہ تو ان کی بھل منساہت ہے۔" سرلا بین نرمی سے مسکرائیں۔

"اے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ آج سیٹ دیتے ہیں، کل دل بھی دیں گے۔" سعادت کی بہو نے گود کے لونڈے کو کولہے پر ٹھسک کر فیصلہ کیا، اس پر سب چہک اٹھیں۔

ان پیاری پیاری باتوں سے سرلا بین کی آنکھوں میں بھی خواب جھوم اٹھے۔ انھیں ان مدقوق آبرو باختہ حرافہ عورتوں پر پیار آ گیا۔ دل شکر گزاری کے احساس سے لبریز ہو گیا۔

"اب کی بار دودھ کم اترنے کی شکایت تو نہیں —" وہ بات بدلنے کو ایک دم نرس بن گئیں۔

"ابھی تک تو نہیں۔" سعادت کی بہو منمنائی۔

"اور دیکھ ایڈیتھ۔ اب کے جو کچھ لفڑا ہوا تو قسم سے پولیس میں دے دوں گی۔ لوپ کیوں نہیں لگوا لیتی؟"

"بابا وہ لوگ تو ہسبنڈ کا نام پوچھتے۔" ایڈیتھ بھنّائی۔

"اینڑی صدیک بابو کا نام دے دے —" رام دئی نے مشورہ دیا

"ہٹ، وہ لچّا......"

"تو سرا جی کا نام دے دے۔"

"چپ رہو چڑیلو —" سرلا بین نے سب کو ڈانٹا، اور سعادت کی گود کے لونڈے کو چپ کرنے کے لئے چمچہ بھر سیرپ اسے چٹا دیا۔ "دور ہو یہاں سے۔"

"پہلے یہ بتاؤ شادی کب ہوگی" — شبو اڑ گئی۔

"ہاں تاریخ مقرر ہو جائے —" لکشمی نے مطالبہ کیا

"کس کی شادی؟ کیسی تاریخ؟ کوئی بات نہ چیت" سرلا بین بگڑ گئیں۔

"بات نہ چیت یہ کیسے؟ کیا دولہا گونگا ہے؟" قہقہہ پڑا

اور پھر سب نے بوکھلائی ہوئی سرلا بین کو سمجھایا کہ ان کی ڈھیل سے ہی یہ ہڈ رہا ہوا ہے کہ ان جیسی گنونتی گنواری بیٹھی ہے۔ مرد کی ذات تو ٹھلوا ہوتی ہے، جب تک منہ میں نوالہ نہ ٹھونسو بات نہیں بنتی۔ سب سرلا بین کے بہی خواہ ہیں، دشمن نہیں کہو تو اپنی جانیں بھی تمہارے لئے دیدیں یہ چڑیا اب ہاتھ سے نہ جانی چاہئے

"کہو تو ان سے بات کرنے کو بولوں؟" سعادت کی بہو نے پوچھا۔

"ارے ہم خود بات کرنے کو تیار ہیں ان سے کہ بابا لڑکی پسند ہے تو ایسا بات کرو" مگر رام دلی کی اس بات سے سب کو اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسے مردوں کو پھانسنے میں ملکہ حاصل ہے۔ گر کم بخت کو شادی کا چسکا پڑ چکا ہے، اگر امانت میں خیانت کر گئی تو؟ — نہ بابا رام دلی سے اللہ بچائے

"شاید بے چاروں کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ رعب داب کے کپڑے پہنے چشمہ چڑھا کے جاتی ہیں۔ وہ سوچتے ہوں گے میٹھی نظر سے دیکھا اور جوتے پڑے" شبو نے تشخیص کی۔

"کپڑے لتے کا اثر تو پڑتا ہے —"

"ڈیوٹی کی اور بات ہوئی۔ پر یہ ہر گھڑی ڈاکٹرنی بنی رہتی ہیں —"

"عورت کو کچھ سنگار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ارے یہ مکھڑا اس پہ میک ہو تو قسم سے، شری مان کے چھکے چھوٹ جائیں گے"

"اور کپڑے بھی بھڑک دار ہوں"

"تھوڑا بہت تیل پھلیل"

"ہاتھوں میں چوڑیاں"

"کانوں میں آویزا ـــــ پھر دیکھتے ہیں بابو جی کہاں جاتے ہیں ۔"

سرلابین نے اس وقت تو سب کو جھڑک دیا۔ مگر سوچ میں پڑ گئیں ــ یہ دنیا کا دستور ہے۔ بمبئی میں ایک سے ایک بھڑک دار عورت گھومتی ہے۔ سونی سادی عورتوں پر تو نظر ہی نہیں ٹکتی ــــ جیسا موقع ویسا بھیس۔

مگر ان کے پاس تو سادی سوتی کنی کی ساڑیاں تھیں۔ دو چار بدرنگ سی کھٹاؤ کی ہوں گی۔ گلے میں تار سی زنجیر تو پڑی ہی رہتی ہے۔ اگرچہ اسے زیور کہنا زیادتی ہے، ماں کی یادگار ہے۔

رات کے سناٹے میں ان کے دماغ میں رنگ برنگے کپڑے اور زیور تھر کتے رہے۔

"شاید بیاہتا ہے۔" دوسرے دن شبو نے فکرمند ہو کر کہا

"نہیں بیاہے تو نہیں۔"

"کیسے معلوم ؟"

"بس میں کوئی دوست ملے تو پوچھ رہے تھے۔ کمرہ ملا۔ وہ بولے ہاں ملا۔ کہنے لگے، اب شادی کر ڈالو۔"

"پھر کیا بولے ؟" رام دئی قریب کھسک کر بولی۔

"ہنسنے لگے۔"

"چلو ادھر سے تو اطمینان ہوا۔ ذات کے تو ٹھیک ہیں ؟"

"ہاں، بیگ پر، رام سروپ بھٹناگر لکھا ہے۔ وہ تو پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔"

"بس پھر کیا بات رہ گئی جو ٹال مٹول کر رہی ہو ؟"

"منہ سے جو نہیں بولتے۔"

"کچھ میٹھی نظروں سے کہتے ہوں گے ؟"

"نہیں ـــــ"۔ جو کہتے بھی ہوں گے تو سرلابین کے کاہے پلے پڑے گا۔ رام دئی ہوتی، ایڈتھ ہوتی، شبو ہی ہوتی تو فٹ سمجھ جاتی، دو دن میں بابو جی مٹھی میں ہوتے۔

"ٹھنڈی سانس بھری؟"

"نہیں ـــــ"

"توبہ! مردوا کون سی مٹی کا بنا ہے" سعادت کی بہو بگڑ گئیں۔

بڑی کائیں کائیں کے بعد طے ہوا کہ سرلا بہن دور اندیشی پر تیار ہوں۔ تیر تفنگ سے لیس ہو کر موہنہ میں نوالہ دیں تب ہی نیا پار لگے گی۔

بس اسی کارن عورتیں اپنے اپنے ترکشوں سے سامان نکال نکال کر سرلا دیوی کی کمک پر پہنچنے لگیں۔ شبانہ کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا کام بھی لے لیتی تھی۔ وہ وہاں سے نہ جانے کیا کیا اٹرم سٹرم لایا کرتی تھی۔ ریزلین اسنو تو سعادت کی بہو کے پاس بھی سال بھر پرانی پڑی تھی۔ ایڈتھ کے پاس تو تمام امنگل کیا ہوا کاسمیٹک تھا۔ وہ ایک ہیر ڈریسر کو بھی جانتی تھی اور خود بھی فسٹ کلاس غبارے نما اونچے تونبی جیسے بال بنا لیتی تھی۔ اس کے پاس ایسے ایسے چھوٹے بڑے کپڑے تھے جو اگر کھمبے کو پہنا دو تو بُتِ کافر بن جائے۔

بس سب کی سب مرمت پر جٹ گئیں۔ سرلا بہن نے بہت نا نا کی مگر شبو نے اپنی پیازی نائیلان جارجٹ کی ساڑی، جس پر سیکونس کا کام بنا تھا، اُنھیں پہنائی۔ بلاوز پر بہت جھگڑا پڑا شبو کہتی تھی تازہ ترین فیشن کے مطابق سرخ بلاوز اور سرخ پیٹی کوٹ ہونا چاہیے۔ نیچے سے جھلکا مارے گا اور لال ہی سنڈل ہو تب آئے مزہ۔ سرلا بہن نگوڑی کو نہ فیشن کا پتہ نہ میچنگ کے راز معلوم۔ ان کے ہاتھوں میں کھیل بنتی رہیں۔

منہ پر پہلے کریمیں تھوپی گئیں، مع سعادت کی بہو کی ریزلین اسنو کے، جو سوکھ چکی تھی، کیوں کہ وہ پُرانا نے جارہی تھی۔ پھر روژ اور پاؤڈر کے پلستر چڑھے خوب سا سیاہ سوت لے کر تونبی کی شکل کا جوڑا بنا، پھر زیور کی باری آئی۔ اس پر خانہ جنگی ہوتے ہوتے بچی۔ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اس کا چندہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

جب اونچی ایڑی کے کارچوبی سینڈل پہن کر سرلا بہن بس اسٹاپ پر لہراتی ڈگمگاتی پہنچیں تو

ان کی بغیر عینک کی آنکھوں میں ترمرے ناچ رہے تھے، پسینے کے شرارے چھوٹ رہے تھے۔

"کیا عورت ہونا کافی نہیں۔ ایک نوالے میں اتنا اچار چٹنی، مربہ کیوں لازمی ہے۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔ اور پھر اس نوالے کو بچانے کے لئے ساری عمر کی گھس گھس ـــــ جب تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے سرلا بہن کو لشتم پشتم واپس لوٹتے دیکھا تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ بغیر دولہا کے ڈگمگاتی لرزتی چلی آرہی تھیں۔ گالوں پر کاجل کی لکیریں بہاتی وہ گٹر میں گرتے گرتے بچیں۔

نوالہ تھوک دیا گیا!

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ سرلا بہن سوالوں کی بوچھار سے بے دم ہو کر پلنگ پر گر پڑیں۔

وہ جب بس میں داخل ہوئیں تو وہ ان سے قطعی غافل اخبار پڑھتا رہا۔ وہ رکاب پکڑے سیٹ کے پاس کھڑی جھولتی رہیں اور وہ بس کے دروازے کی طرف بار بار دیکھتا رہا۔ جیسے کسی کے چڑھنے کا منتظر ہو۔

اُنھوں نے نظروں کے سارے تیر اس کے کلیجے میں جھونک دیئے مگر وہ ان کی طرف سے منہ موڑے دروازے کو تکتا رہا۔ اُنھوں نے کانتا کی مہک میں بسا ہوا گلابی آنچل ڈھلکایا۔ مگر اس نے اخبار سے نظریں نہ اُٹھائیں۔

اُنھوں نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ مگر اس کی آنکھوں میں مستیاں نہ لہرائیں۔ اس نے ایک پتھرائی ہوئی سی نظر ان پر ڈالی اور ان کے دھوم دھڑکے کو بے اعتنائی سے ٹکراتا ہوا اخبار پر جھک گیا۔ ـــــ سامنے کی ایک سیٹ خالی ہو گئی اور وہ اس پر ڈھے گئیں۔ سارے تیر سنناتے ہوئے وار خالی کر دیے گئے اور خالی ترکش لرزتا رہا، کانپتا رہا۔

ڈرتے ڈرتے اُنھوں نے اپنی سیٹ سے مُڑ کر دیکھا۔ وہ بس سے اُتر کر جا رہا تھا۔ اُترتے وقت اس نے بس اسٹینڈ پر دھندا چلاتے ہوئے ستو گرہ کٹ سے پوچھا "کیوں رے پاجی، آج سرلا دیوی نہیں آئیں؟"

ستو گرہ کٹ ہکلاتا رہ گیا، اور اجنبی لمبے لمبے ڈگ بھرتا سامنے گلی میں گم ہو گیا۔

••

احمد ندیم قاسمی

سفید گھوڑا

یہ الیاس کا فون تھا۔

میں نے کہا " میں ابھی آیا ۔ وہیں اپنے پرانے ہوٹل میں ٹھہرے ہونا ؟"

الیاس کی آواز آئی ۔ " ٹھہرا ابھی وہیں ہوں اور وہیں سے بول بھی رہا ہوں، مگر تم ابھی نہ آؤ۔ اس وقت میں ایک دفتر جا رہا ہوں، بہت ضروری کام ہے ۔ لاکھوں کا معاملہ ہے ۔ اسی لئے ہوائی جہاز سے آیا ہوں اور کل ہوائی جہاز ہی سے واپس پنڈی چلا جاؤں گا ۔ تم شام کو آنا ۔ ٹھیک آٹھ بجے، بلکہ ساڑھے سات بجے ۔ اور رؤف سنو ۔ اب تو تم اور بھی بڑے افسر ہو گئے ہو ۔ آج کل تمہیں کون سا برانڈ پسند ہے ۔"

میں نے جواب دیا " وہی جسکی تم نے لت ڈالی ہے ۔ سفید گھوڑا ! "

الیاس بولا " بس ٹھیک ہے، سفید گھوڑا بھی ہو گا اور سفید گھوڑی بھی ۔"

میں نے بن کر پوچھا ۔ " یہ کوئی نیا برانڈ نکلا ہے ؟ "

اور وہ اتنے زور سے ہنسا اور ہنستا چلا گیا کہ مجبوراً مجھے بھی ہنسنا پڑا ورنہ میں ایسی باتوں میں شاید ہی ہنستا تھا ۔ میں ہنسا تو وہ سمجھ گیا کہ میں نے سفید گھوڑی کا مفہوم سمجھ لیا ہے ۔ اس لئے وہ بولا :

" خفا تو نہیں ہو گئے ؟ " پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا " یار تم اب تک الّو کے الّو ہی رہے ۔"

میں نے کہا: "یہ تو خیر شام کو طے کریں گے کہ ہم میں بڑا اُلّو کون ہے۔"
وہ بولا: "بہت اچھا۔ تو پھر ساڑھے سات بجے بلکہ سوا سات بجے طے؟"
میں نے کہا: "طے۔"

سوا سات بجے میں الیاس کے ہوٹل پہنچا تو وہ نہا رہا تھا۔ میں نے کہا: "یہ کون سا وقت نہانے کا ہے؟"
غسل خانے میں سے بولا۔ "ارے تمہیں اب تک خبر نہیں؟ میں تو غسل کر کے وسکی پیتا ہوں میرا چھوٹا اٹیچی رکھا ہے نا۔ اُسے کھولو۔ اس میں تمہارا سفید گھوڑا بندھا ہے۔"
میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "مجھے سفید گھوڑے کا یہ تھان کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔"
الیاس ہنسنے لگا۔ پھر بولا: "الماری میں ہوگا۔ تم اس کی اگاڑی پچھاڑی کھولو، میں پہنچتا ہوں۔"
میں نے اٹیچی میں سے وائٹ ہارس کی بوتل نکال کر میز پر رکھی تو وہ تولیہ لپیٹ کر باہر آگیا۔
اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور سائڈ والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک وسیع و عریض پلنگ پر دو تکیے سجے تھے۔ بولا۔ "یہ ہے سفید گھوڑی کا تھان۔"
مجھے الیاس کی اس حرکت سے ہمیشہ کی چڑ تھی اس لئے شاید میرے تیور دیکھ کر وہ بولا: "یہ سب نشے ہیں میری جان۔ شراب پینا، عورت سے پیار کرنا۔ سچ بولنا، ڈاکہ مارنا — یہ سب نشے ہیں۔ جو شخص ان میں سے کوئی نشہ کرتا ہے، اُسے دوسرے نشوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ تم چلو۔ میں کرتا پائجامہ پہن کر ابھی آیا۔"
پھر اِدھر سے الیاس بڑے کمرے میں داخل ہوا، اُدھر سے ہوٹل کا ایک سنجیدہ اور باوقار بیرا آیا۔ بہت نیک آدمی لگتا تھا۔ بس ماتھے پر محراب کی کمی تھی۔ پھر وہ الیاس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اس مسکراہٹ نے اس کی پوری شخصیت بدل ڈالی۔ ایسا لگتا تھا کہ یا تو وہ آنکھ مار دے گا یا چھرا نکال لے گا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس نے آنکھ مار دی اور پھر دروازے کا پردہ یوں اُٹھا

جیسے چھرا نکالا ہے۔

پہلے ایک عورت اندر آئی۔ یہ بڑی تندرست تھی، خون اس کے پورے چہرے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ یہ خون اس کی آنکھوں میں بھی چمک رہا تھا اور اس کی ہتھیلیوں میں بھی۔ اس کے جسم کا باقی حصہ برقعے میں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی طرح لہو لہان ہوگا۔ میرا جی چاہا تعارف ہو جائے تو اس سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کون سے وٹامن کھاتی ہیں۔"

ایک قدم اندر آ کر اس نے ہم دونوں کو ایک نظر دیکھا پھر الیاس کا رُخ کر کے اس نے آنکھیں جھکائیں اور سلام کے طور پر سر کو ذرا سا خم کیا۔ فوراً بعد وہ پلٹ کر جیسے سرگوشی میں بولی۔ "آ بھی جاؤ نا بلقیس!"

بیرا اسی طرح پردہ اٹھائے کھڑا تھا اور اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

عورت نے الیاس سے کہا۔ "نئی نویلی ہے نا۔ ڈرتی ہے" پھر وہ دروازے میں گئی "بیوقوف ہو تم تو۔ بالکل ہی دیہاتن ہو۔ اب ایسا بھی کیا آجاؤ نا بلی"۔"

الیاس نے تکیے کے نیچے سے بٹوا اٹھا کر ایک سو کے بہت سے نوٹوں میں سے ایک نوٹ نکالا اور دروازے کے پاس جا کر بولا۔ "یہ لیجیئے میرے کمرے کی دہلیز الانگنے کا نذرانہ!"

عورت نے فوراً الیاس کے ہاتھ سے نوٹ لے لیا اور بولی۔ "اب تو آنا ہی پڑے گا بلو یہ لو۔" اس نے نوٹ والا ہاتھ آگے بڑھایا مگر پھر اسے تہہ کر کے مٹھی بند کر لی اور سرگوشی میں بولی "اری پگلی ہوٹل کا معاملہ ہے۔ چلو اب جلدی سے آ جاؤ۔ ایک گھنٹے سے جو میں تمہیں سمجھا رہی تھی تو کیا اس کا تم پر یہی اثر ہوا؟ بے وقوف!" پھر باہر جا کر اس نے بلقیس کو جیسے دھکا دے دیا۔

بیرے نے پردہ گرا دیا تو الیاس بولا۔ "دیکھو سراج کچھ بھیج دو۔ کباب اور تکّے۔ کیوں ٹھیک ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا مگر جواب عورت نے دیا۔ "ذرا تیز مرچوں والے کباب ہوں بھئی سراج؟"

سراج چلا گیا۔ الیاس نے بڑھ کے چٹخنی چڑھا دی اور بولا "تشریف رکھیے۔"

سب بیٹھ گئے۔ بلقیس بھی بیٹھ گئی مگر اس نے برقعے کی نقاب گرا رکھی تھی۔

"یہ میری عجیب دیوانی بیٹی ہے" عورت اپنے برقعے کے بٹن کھولتے ہوئے بولی۔ "یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ آپ نے اس کا چہرہ تو ابھی نہیں دیکھا مگر اس کا قد تو پسند ہے نا آپ کو؟"

الیاس بولا — "جی ہاں — سبحان اللہ!"

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹ کر الیاس کو دیکھا۔ اتنے پیارے اور مقدس الفاظ اس نے کتنے اوباش لہجے میں ادا کیے تھے۔

الیاس میری اس حرکت سے بہت محظوظ ہوا۔ وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "یہ میرے دوست ہیں مگر بہت شرمیلے۔ ان سے قسم لے لیجئے جو انھوں نے آج تک کسی عورت کو چھوا بھی ہو۔ ان کا نام رؤف ہے مگر آپ انھیں مردوں کا بلقیس سمجھ لیجئے۔"

عورت بے اختیار ہنسنے لگی۔ وہ اتنی ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر اس نے برقعہ اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ توبہ! وہ کس بلا کی صحت مند عورت تھی۔ اس کے ننگے بازوؤں میں مچھلیاں سی تڑپ رہی تھیں اور اس کا بلاوز فولاد کی جالی سے بنا ہوگا ورنہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہوتا۔

"سن لیا بلقیس!" عورت بولی۔ "ذرا سی بھی حیا ہو تو اب برقعہ اتار دو۔ نہیں اتارو گی تو میں تمہیں عورتوں کا رؤف کہنے لگوں گی۔"

اب کے الیاس بے اختیار ہنسا اور ساتھ ہی اس نے میرے بازو میں اس زور کی چٹکی لی جیسے وہ میرا دشمن ہو۔ میں نے اس میں اتنی وحشت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

دروازے پر جیسے کسی نے انگلی کے جوڑ سے پُراسرار دستک دی۔ الیاس نے دروازہ کھولا سراج ٹرے میں کباب اور تکے سجی کر لایا اور میز پر رکھ کر بولا۔ "اور کوئی حکم۔"

"ضرورت پڑی تو میں گھنٹی بجا دوں گا" الیاس نے کہا۔

سراج واپس جاتے ہوئے رکا۔ پہلے بلقیس کی طرف دیکھا۔ پھر الیاس کو وہی خوفناک آنکھ مار

کر بولا" یوں کب تک بیٹھے رہیں گے صاحب! ___ منہ دکھائی دیجیے اور پھر ___ اور پھر سے کھایئے یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا اور وہ عورت مسلسل ہنستی چلی گئی۔ "بڑا بدمعاش ہے یہ سراج ـ چل ہٹ۔ اور دیکھ ایک اچھی سی نئی سی ٹیکسی روکے رکھنا ـ میٹر بے شک ابھی سے ڈاؤن کر دے۔ کیوں جی؟" اس نے الیاس سے پوچھا۔

"ضرور ضرور" الیاس بولا۔ اور سراج چلا گیا تو اس نے دروازہ بند کر کے اور پردہ کھینچ کر بٹوے میں سے ایک سو کا ایک نوٹ نکال کر دونوں ہاتھوں پر یوں رکھا جیسے طشتری میں سجایا ہے۔ عورت نے اُٹھا کر تہہ کیا اور پہلے نوٹ سمیت اسے بلاوز میں اڑس کر مسکرائی۔ سر کو یوں جنبش دی۔ جیسے اجازت دے رہی ہے ـ الیاس پلٹا اور بلقیس کی نقاب اُلٹ دی۔

وہ بڑی عجیب سی لڑکی تھی۔ عجیب یوں کہ کچھ ایسی خوبصورت تو نہیں تھی مگر خوبصورت لگتی تھی ـ اس کا رنگ بہت سفید تھا مگر اس کے چہرے کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس میں کچھ کمی رہ گئی ہے ـ البتہ اس سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا کہ کمی کہاں رہ گئی ہے ـ اس کا ہر نقش دوسرے نقش کا سہارا بنا ہوا تھا۔ اس کا حسن زنجیر کی کڑیوں کا سا تھا۔

نقاب اُلٹتے ہی اُس نے کنکھیوں سے عورت کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ "لو ایسی واہیات شرم بھی کیا۔ میں نے گھر سے چلتے ہوئے بتا نہیں دیا تھا کہ اپنے آدمی ہیں؟"

الیاس نے تپائی اُٹھا کر بلقیس کے سامنے رکھی۔ پھر اس پر وائٹ ہارس کی بوتل اور چار گلاس رکھ دیئے۔ اور بلقیس پہلی بار بولی۔ "جی میں تو اس نعمت سے محروم ہوں"

الیاس نے احتجاج کیا ـ "اس نعمت سے تو روؤف کا سا اُلّو بھی محروم نہیں ہے اور آپ؟"

عورت نے الیاس کی بات کاٹی ـ "سراج نے کہا تھا کہ آپ کو تازہ مال چاہئے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بلقیس بے چاری آج پہلی بار کسی ہوٹل میں جائے گی ـ اسے کیا پتہ کہ یہ سب کیا ہوتا ہے ـ تپائی یہاں میرے پاس لایئے"

مگر الیاس اُٹھ کر عورت اور بلقیس کے درمیان بیٹھ گیا اور بلقیس کی ٹھوڑی

کے نیچے سے برقعے کی ڈوری کی گرہ کھولتے ہوئے با قاعدہ گانے لگا ؎

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

"مجھے تو کوئی سکواش پلا دیجئے۔" بلقیس نے بچوں کی طرح فرمائش کی اور جب تک الیاس گھنٹی بجانے کے لئے اٹھتا میں نے کہا۔ "میں لاتا ہوں۔"

"ہائیں"۔ عورت جھکی "مروکوف صاحب تو بولتے ہیں۔"

اس پر عورت اور الیاس کے علاوہ بلقیس کو ہنستا پا کر الیاس اور زور سے ہنسا اور میں باہر نکل آیا۔ سراج کو سکواش بھجوانے کو کہا اور وہاں سے گھر کی راہ لی۔

یہ لڑکی میرے ذہن پر مسلط ہو گئی تھی۔ الیاس کے یہاں یوں تو میں نے کئی عورتیں دیکھی تھیں ان کی صورتیں مختلف تھیں۔ مزاج مختلف تھے۔ مگر مسکراہٹ کے معاملے میں وہ سب ایک جیسی تھیں وہ مسکراتی تھیں تو لگتا تھا وہ یہ مسکراہٹ بازار سے خرید کر لائی ہیں۔ وہ شرماتی تھیں تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں بڑا تکلف کرنا پڑ رہا ہے مگر یہ لڑکی تو بالکل ایسی لڑکی تھی، جیسی متوسط طبقے کے گھروں میں ہوتی ہیں۔ معصوم، بے خبر اور راضی برضا۔ مجھے الیاس پر غصہ تو کئی بار آیا تھا مگر نفرت آج پہلی بار محسوس ہوئی۔

جب چند برس پہلے میں نے بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد اُسے آٹے اور چینی کا ڈپو دلوایا تھا تو وہ کتنا پیارا آدمی تھا۔ بس کبھی کبھار شراب پیتا تھا اور سہگل کی طرز میں غالب کی غزلیں گاتا تھا۔ آواز بہت سُریلی تھی اس لئے شراب نوشی کی ہر محفل میں مدعو ہونے لگا۔ یوں اس کی وجہ سے مجھے بھی شراب نوشی کی لت پڑ گئی۔ پھر اونچے طبقوں کی محفلوں میں مسلسل شرکت کی برکت سے اُسے چند لاکھ کا درآمدی لائسنس مل گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ کئی لاکھ نقد کی اسامی بن گیا۔ وہ پنڈی چلا گیا اور وہیں اپنا صدر دفتر قائم کیا۔ اب وہ لاہور اور کراچی میں بعض ملیں لگانے کی سوچ رہا تھا۔ انہی دنوں وہ ایک بار پنڈی سے لاہور آیا تو مجھے اسی ہوٹل میں مدعو کیا اور وہیں پہلی

بار مجھے معلوم ہوا کہ وہ شراب کے علاوہ عورت سے بھی شوق کرنے لگا ہے۔ دوست آدمی تھا اور پھر اس نے اتنا امیر ہو جانے کے باوجود میرے ابتدائی احسان کو یاد رکھا تھا۔ اس لئے وہ جب بھی لاہور آیا میں اس کی غروب آفتاب کے بعد کی مشغولیتوں میں شامل رہا۔ لاہور میں اس کی تیسری یا چوتھی آمد پر میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ "شراب کی حد تک ٹھیک ہے کہ تم جس سوسائٹی میں گھومتے ہو، اس میں شراب نہیں پیو گے تو بد تہذیب بھی کہلاؤ گے اور کاروبار کو بھی نقصان پہنچاؤ گے۔ مگر یہ عورت والا قصہ چھوڑ دو۔ عورت کسی نہ کسی کی بیٹی یا بیوی یا ماں ضرور ہوتی ہے اور ہم پاکستان کے رہنے والے ہیں اور یہ رشتے ہمارے لئے آج بھی مقدس ہیں۔ سو تم یوں کرو کہ شادی کر لو۔" اس پر اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے شادی کر لی ہے اور اس کی ایک پیاری سی بیوی ہے اور تین بچے ہیں اور۔ فکر نہ کرو رؤف میری بیوی پرانے زمانے کی عورت نہیں ہے میں اسے ہر مہینے دو ہزار نقد پیش کر دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں اس نے مجھے ہر بات کی اجازت دے رکھی ہے!"

میں نے سوچا، صرف جیب کے بھاری یا خالی ہونے سے قدریں کیسے بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ میں چپکا مو رہا۔ مگر جب بھی گفتگو میں کبھی اس کے گھر کا ذکر آیا تو میں نے اس کی بیوی کے بارے میں "تمہاری بیوی" کہہ کر بات کی۔ اسے بھابی نہ کہا۔ کیوں کہ بھابیاں اپنے شوہروں کو ہر رات ایک نئی عورت کا انتظام کر لینے کی اجازت نہیں دیا کرتیں۔

میں نے شاید صرف اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے یہ فلسفہ گڑھ لیا تھا کہ الیاس اگر عیاش ہے تو اس کی عیاشی صرف ایسی عورتوں تک محدود ہے جو الیاس کے پاس نہیں آئیں گی تو کسی اور کے پاس چلی جائیں گی۔ سو ہے تو یہ خراب بات مگر کچھ ایسی بھی خراب نہیں ہے کہ میں اتنے اچھے دوست سے نفرت کرنے لگوں۔

مگر بلقیس کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ الیاس عیاشی کی حدیں پھاند گیا ہے اور میں نے تو پاگلوں کو بھی دیکھا ہے کہ تھوکنا چاہیں گے اور سامنے پھولوں سے لدی جھاڑی ہو گی تو اس سے ہٹ کر تھوکیں گے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یقین ہو گیا تھا کہ الیاس دراصل کمینہ آدمی ہے۔

خاصی دیر تک پلنگ پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں ایک دم اُٹھا اور چپل گھسیٹتا باہر لپکا۔ میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار کو محفوظ حد تک جس قدر تیز چلا سکتا ہے چلائے میں نے اُسے میٹر سے دوگنی رقم دینے کا وعدہ کیا اور کار الیاس کے ہوٹل کی طرف اُڑنے لگی۔ میں نے بڑا ظلم کیا تھا کہ الیاس کے کمرے ——— اس لڑکی کے داخل ہوتے ہی اسے رخصت نہ کر دیا تھا۔ الیاس یقیناً برا مانتا مگر وہ میری نیت پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ یقیناً میری بات مان لیتا اور ایک معصوم لڑکی ہمیشہ کے لئے تباہ ہونے سے بچ جاتی۔ وہ لڑکی جوان سب لڑکیوں کی نمائندہ تھی جن کے والدین اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی خاطر اپنے آپ کو بیچ ڈالتے ہیں مگر جب یہ ذریعہ بھی کارگر نہیں ہوتا تو اپنے مستقبل کی خاطر بیٹیوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روک کر میں نے دُگنا کرایہ ادا کیا اور اوپر لپکا، مگر سیڑھیوں ہی میں سراج مل گیا۔ وہ نکّوں، کبابوں کی خالی پلیٹیں اُٹھائے لا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو وہی شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں بلکہ اس کے سارے چہرے پر کود دی۔ پھر وہ بولا۔ " صاحب تو بیوی کو لے کر ابھی ابھی کہیں چلے گئے ہیں " میں نے پوچھا " کہاں گئے ہیں؟ کچھ بتا کر نہیں گئے "۔ ہنس کر بولا ——" بھولے بادشاہو۔ یہ بھی کوئی بتانے والی باتیں ہوتی ہیں؟ "

گھر آکر میں نے الیاس کو ایک طویل خط لکھا۔ جس میں اُسے کمینہ اور خبیث و رذیل تک کہہ ڈالا میں نے اس سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا اور اسے خبردار کیا کہ وہ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے " میں تم جیسے اخلاق باختہ بدکاروں پر لعنت بھیجتا ہوں "

ظاہر ہے اس کے بعد الیاس سے میری کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ پھر میرا تبادلہ لاہور سے کراچی ہو گیا اور یوں میں پنڈی سے اور دور ہو گیا۔

کراچی میں پہلے روز جب میں اپنے اسٹاف سے ملا تو اس صف میں اپنے ایک پرانے دوست اور ہم جماعت مشتاق کو بھی کھڑا پایا۔ وہ اس دفتر میں میرا ہیڈ کلرک تھا۔ اس سے مل کر مجھے بہت خوشی

ہوئی۔ کالج کے زمانے میں وہ بڑا پرہیزگار مشہور تھا اور سب نے اس کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے گھڑ رکھے تھے اور اس سے جنت کے ویزے لینے آتے تھے۔ اب بھی میں نے دیکھا کہ وہ صورت سے بدستور نیک آدمی ہے۔ شام کو اس نے مجھے دعوت پر اپنے گھر بلایا اور جب سب معززین شہر سے میرا تعارف کرا چکا تو الماری میں سے وائٹ ہارس کی دو بوتلیں نکالیں اور ہم سب کے ساتھ پینے بیٹھ گیا۔ حیرت ہوئی مگر شراب کی حد تک میں بڑا فراخ دل ہوں۔ سب کو معاف کر دیتا ہوں اس لئے اسے بھی معاف کر دیا۔

پھر جب کھانے کے بعد سب مہمان چلے گئے تو وہ بولا" آپ دوسرا شوق بھی یقیناً فرماتے ہونگے؟"

میں نے پوچھا ـــ "دوسرا شوق؟"

اور مشتاق کچھ اس طرح مسکرایا کہ میں نے ایک پل کو یہ بھی سوچا کہ کہیں مشتاق کے روپ میں یہ لاہور کا ہیرا سراج تو نہیں ہے! پھر وہ اُٹھا اور بولا "میں نے یہ انتظام بھی کر رکھا ہے"

اس نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا تو خوشبو سے لدی ہوئی ایک عورت مٹکتی اور مسکراتی ہوئی اندر آگئی میں سمجھا یہ مشتاق کی بیوی ہے۔ اس سے میں ادب سے کھڑا ہو گیا۔ پھر جب میں صوفے پر بیٹھا تو مشتاق اسی سراج والی مسکراہٹ سے بولا "شوق فرمایئے" اس کے ساتھ ہی وہ عورت صوفے کے اس طرف سے کھسک کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

میرا جسم جیسے بجلی کے ننگے تار سے چُھو گیا۔ میں تڑپ کر اُٹھا تو عورت اور مشتاق بہت زور سے ہنسے مگر پھر جب مشتاق کو باقاعدہ گالیاں دینے لگا تو عورت تیر کی طرح دوسرے کمرے میں گھس گئی اور مشتاق مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔

میں گھر آیا تو جیسے اس عورت کی خوشبو میرے ساتھ چمٹی چلی آئی ہو۔ میں نے اُسے صرف ایک نظر دیکھا تھا مگر ایسی عورتوں کو ایک نظر دیکھنا بھی کافی ہوتا ہے ایسی عورتیں میں نے اطالوی مصوّروں اور یونانی مجسمہ سازوں کے یہاں تو دیکھی ہیں مگر عام زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں کتنی دیر وہ میرے ساتھ لگی قہقہے مارتی رہی اور خوشبو لنڈھاتی رہی۔ نیند میں بھی اس نے

میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے یاد آیا کہ ایک بار وہ بادل کو چادر کی طرف لپیٹ کر آسمان پر جا بیٹھی تھی اور پھر سر پہ ستاروں بھری ٹوکری رکھے آئی تھی اور انھیں میرے قدموں پر نچھاور کر کے مجھ سے لپٹ گئی تھی اور میں یوں ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا تھا جیسے میرا جسم بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہے۔

دوسرے روز میں نے جان بوجھ کر مشتاق کو کوئی دس بارہ مرتبہ اپنے دفتر میں بلایا مگر اس نے مجھ سے آنکھیں ہی نہ ملائیں۔ وہ مجھ سے شرمندہ تھا اس لئے اسے پتہ ہی نہ چلا کہ میں اس سے بھی زیادہ شرمندہ ہوں۔

دفتر کا وقت ختم ہوا تو میں نے اسے بلایا۔ اسے بازو سے پکڑا اور کار میں زبردستی لا بٹھایا۔ وہاں وہ پہلی بار بولا — "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔"

میں بولا "میں بھی تم سے بہت شرمندہ ہوں، مگر تم سے بھی زیادہ اس بیچاری عورت سے شرمندہ ہوں۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوگی کہ کسی بدتمیز سے سابقہ پڑا۔ عورت چاہے کیسی بھی ہو، اس کا احترام کرنا چاہیئے اور کل میں نے بڑی بدتہذیبی، بڑے اُجڈپنے کا مظاہرہ کیا۔ دراصل یہ شراب انسان کو بھی سفید گھوڑا بنا دیتی ہے۔ تم تو خیر میرے پرانے دوست ہو تمہیں تو میں تمہارے کان مروڑ کر بھی منا لوں گا مگر کسی طرح مجھے اس عورت کے پاس لے چلو۔ میں اس سے معافی نہیں مانگوں گا تو میرا ضمیر میرے لئے عذاب بنا رہے گا۔" وہ بہت کمال کی عورت نکلی۔ اس نے مجھے فوراً معاف کر دیا۔ پھر وہ مشتاق کی موجودگی ہی میں مجھ سے لپٹ کر رونے لگی اور بولی: "مجھے تو پہلی ہی نظر میں آپ سے محبت ہو گئی ہے۔" اور ظاہر ہے اس فقرے کے ختم ہونے کے فوراً بعد مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔

پھر اچانک وہ عورت کہیں اندرون سندھ چلی گئی اور وہاں کسی بڑے زمیندار سے باقاعدہ عقد کر کے پردے میں بیٹھ گئی۔ میں نے دفتر سے چھٹی لے لی اور مشرقی پاکستان کے کسی انتہائی مشرقی گوشے میں تبادلہ کرانے کا پروگرام بنا لیا مگر بھلا ہو مشتاق کا کہ وہ میری مدد کو پہنچا۔ کالج کی بعض ہوائی دوستیاں بھی کتنی پائدار ثابت ہوتی ہیں۔ اس نے میرے تبادلے کے پروگرام کو منسوخ کر کے ہر رات ایک نئی عورت کا پروگرام مرتب کیا اور اس پروگرام پر عمل کر کے میں نے اپنی محبت کی ناکامی کے سبب

زخم مندمل کر لئے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میں نے سوچا کہ میں نے کتنی ذرا سی بات پر الیاس کے سے دوست سے تعلقات ختم کر دیئے تھے میں نے الیاس کو دل سے معاف کر دیا اور اسے خط لکھا۔ اس کا فوراً جواب آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اس اطلاع سے اتنا خوش ہوا کہ زندگی میں پہلی بار اس نے دوپہر کو شراب پی لی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دسمبر میں کراچی آ کر مجھ سے ایک بہت بڑا جشن منوائے گا۔ اس لئے سفید گھوڑے کے علاوہ اس کے لئے ایک اچھوتی سفید گھوڑی مخصوص کر دی جائے۔

میں نے مشتاق سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ایک بہت امیر کاروباری کے متعلق بتایا کہ ۔۔ "عرصے سے اس کا ایک کام اٹکا ہوا ہے۔ آپ کے قلم کی ذرا سی جنبش سے یہ کام ہو سکتا ہے مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے۔ مگر نہ کوٹھی کی بات کرتا ہے نہ کار کی۔ کہتا ہے، صاحب سے کہو: "میں اچھوتے سے اچھوتا مال پیش کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کاروں، کوٹھیوں کو مارو گولی۔ بہت جمع ہو چکی ہیں۔ تم آج ہی اس سے بات کرو کہ صاحب مان گیا ہے۔ پھر اسی سے الیاس کا بندوبست کرنے کو بھی کہیں گے۔"

مشتاق گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آ کر اطلاع دی کہ آج شام کو سب انتظام ہو جائے گا۔

شام کو مشتاق بڑی سنجیدہ اور باوقار صورت لئے میرے کمرے میں آیا تو میں میز پر وائٹ ہارس کی بوتل رکھے بیٹھا تھا۔ پھر اس نے مجھے سراج کی طرح آنکھ ماری اور پردہ اٹھا دیا۔

پہلے ایک عورت اندر آئی۔ یہ بڑی تندرست عورت تھی۔ خون اس کے پورے چہرے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ یہ خون اس کی آنکھوں میں بھی چمک رہا تھا اور اس کی ہتھیلیوں میں بھی۔

اس نے میری طرف دیکھا اور جیسے لمحے بھر کے لئے منجمد ہو کر رہ گئی مگر پھر فوراً ہی اس نے آنکھیں جھکائیں۔ سلام کے طور پر سر کو ذرا سا خم کیا اور جیسے سرگوشی میں بولی "آ بھی جاؤ نا رضیہ" پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "نئی نویلی ہے نا۔ ڈرتی ہے" پھر وہ دروازے میں گئی "آ بھی جاؤ نا رضو" پھر باہر جا کر اس نے رضیہ کو جیسے دھکا دے دیا۔

اس نے جونہی میرے کمرے میں قدم رکھا۔ میں نے بڑھ کر اس کی نقاب ایک جھٹکے سے الٹ دی اور وہ صوفے پر گر سی پڑی۔

وہ بڑی عجیب سی لڑکی تھی۔ عجیب یوں کہ کچھ ایسی خوبصورت تو نہیں تھی مگر خوبصورت لگتی تھی۔ اس کا ہر نقش دوسرے نقش کا سہارا بنا ہوا تھا۔ اس کا حسن زنجیر کی کڑیوں کا سا تھا۔

"اچھی ہو بلقیس؟" میں دانت بھینچ کر بولا ۔ میں ایسا نہ کرتا تو چیخ پڑتا۔

مشتاق ہنسنے لگا ۔ "بلقیس نہیں صاحب ۔ رضیہ"

عورت ایک دم بولنے لگی ۔ "ذرا جلدی سے جاؤ مشتاق بھائی ۔ کچھ تکے کباب بھجوا دو ۔ اور دیکھو کباب ذرا تیز مرچوں والے ہوں جو مجھے بالکل رلا دیں"

مشتاق چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ عورت کبابوں کے آنے سے پہلے ہی رو رہی ہے۔ اس نے لپک کر چٹکنی چڑھا دی اور پلٹ کر میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ وہ اپنے بھیگے ہوئے گال میرے پاؤں سے رگڑنے لگی اور فریاد کرنے لگی ۔ "میرا پردہ رکھ لیجیے صاحب۔ میرا اور میری بیٹی کا پردہ خدا کے اور آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں کیا کروں صاحب۔ میری ایک ہی بیٹی ہے مگر سب نئی بیٹی مانگتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو کیسے بدلوں صاحب؟ اسی لئے شہر بدل لیتی ہوں۔ مجھ نگوڑی کو کیا پتہ تھا کہ آپ لوگ بھی شہر بدل لیتے ہیں۔ خدا کے لئے صاحب ۔ خدا کے لئے میرا اور میری بیٹی کا پردہ رکھ لیجیے ورنہ کوئی ہمیں دو پیسے کو بھی نہیں پوچھے گا۔"

دوسرے دن میں نے الیاس کو خط لکھا کہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی آنا چاہتے ہو تو ہزار بار آؤ۔ مگر میرے پاس نہ آنا ۔ میں کل رات سے مر چکا ہوں۔

••

شوکت صدیقی

دیوار کے پیچھے

اچانک میری آنکھ کھل گئی کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ کہیں قریب ہی کتّے زور زور بھونک رہے تھے۔ ان دنوں پاس پڑوس میں چوری کی ایک آدھ واردات بھی ہو چکی تھی۔ اس لئے کتّوں کے اس طرح مسلسل بھونکنے سے ذرا تشویش ہوئی۔ میں شہر کے جس علاقے میں رہتا ہوں وہ کسی قدر غیر آباد ہے۔ نہ سڑکوں پر روشنی کا انتظام ہے نہ رات کو پولیس کی باقاعدہ گشت ہوتی ہے۔

آنکھ کھلنے کے بعد میں نے سوچا کہ احتیاطاً اپنے گھر کا بھی جائزہ لے لوں۔ میں نے دروازہ کھولا اور کھنکارتا ہوا باہر آگیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ ہواؤں میں خوشگوار خنکی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز گھر کے پچھواڑے سے آرہی تھی، میں اسی طرف چل دیا۔ میرے مکان کے پیچھے ایک خالی پلاٹ ہے اور اس کے برابر ایک نیم تعمیر مکان ہے، جو غیر آباد ہونے کے باعث رات کی تاریکی میں بھوتوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ راتوں کو یہاں کتّے بسیرا کرتے ہیں یا زیر تعمیر مکانوں پر کام کرنے والے مزدور اور کاریگر اس کو حوائج ضروری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کس منحوس کا مکان ہے، کبھی پلٹ کر ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا کہ میں اس سے احتجاج کر سکوں۔

ہاں تو جب میں عقبی دیوار کے پیچھے پہنچا تو پیچھے سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سُنائی دی
میں لرز کر رہ گیا۔ دل میں کہا لو بھئی آج ہو گیا چوروں سے مچٹیا۔ قبل اس کے کہ میں لپک کر کسی کو بیدار
کروں کہ اسی اثنا چوڑیوں کی ہلکی سی جھنجھناہٹ ہوئی ساتھ ہی کسی عورت نے بہت آہستہ سے کہا۔
"یہ کتے تو ہمارے پیچھے لگ گئے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے آؤ اس خالی مکان میں چلیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" آواز مردانہ تھی۔

معاملے کی نوعیت تو کچھ سمجھ میں آگئی مگر میں چکر میں پڑ گیا کہ اس وقت آدھی رات کو یہاں کون
ہو سکتا ہے۔ کچھ غصہ بھی آیا کہ حرام زادوں کو کہیں اور ٹھکانہ نہ ملا۔ میری ہی دیوار کے پیچھے ان کو
عشق لڑانا رہ گیا تھا۔ جی چاہا کہ ان کو ٹوکوں۔ لعنت ملامت کروں۔ پھر اس خیال سے باز
رہا کہ اپنی بھی نیند حرام ہو گی اور دوسروں کی بھی۔ خواہ مخواہ کا ہنگامہ ہو گا، بات زیادہ بڑھ گئی
تو معاملہ پولس تک پہنچے گا۔ سوچا مجھے کیا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ "پسِ دیوار بیٹھے ہیں تیر اکیا لیتے ہیں"
میں خاموشی کے ساتھ واپس آکر بستر پر سو گیا۔

ابھی ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ بیوی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے۔"

جواب ملا "باہر سارا محلہ اکٹھا ہے۔ کوئی واردات ہو گئی ہے۔"

لوگوں کے زور زور باتیں کرنے کی آوازیں بھی میں نے سُنیں۔ آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھا۔ باہر
جا کر دیکھا تو ایک مکان کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے۔ قریب گیا تو ایک مرد اور عورت نظر آئے۔
دونوں گردنیں جھکائے سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ بات کیا ہے
عورت سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ مرد صورت شکل سے ہرگز نامعقول نہیں
لگتا تھا۔ سیاہ رنگ کی چست پتلون اور اونی سویٹر پہنے، وہ سیدھا سادا ایک عام نوجوان معلوم
ہوتا تھا۔ لوگ ان دونوں کے گرد نیم دائرے میں کھڑے اس طرح گھور رہے تھے جیسے وہ کوئی
عجوبہ ہوں۔

میری طرح کچھ اور لوگ بھی گھروں سے نکل کر وہاں آ گئے۔ ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا۔ "بھئی ہوا کیا۔ معاملہ کیا ہے؟ جواب دینے والا بھی ایک ہی شخص تھا۔ لمبا تڑنگا، نیلی یونیفارم پہنے۔ گلوبند پیٹے وہ بڑی شان سے اکڑا ہوا کھڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاور ہاؤس میں مستری کا کام کرتا ہے۔ ممکن ہے فورمین ہو۔ کچھ بھی ہو، بہرحال آدمی پرلے درجے کا شیخی خورہ ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر چٹخارہ لے کر اونچی آواز سے بتا رہا تھا۔

"بھئی ہوا یہ کہ میں ڈیوٹی ختم کر کے آ رہا تھا۔ جب اس خالی مکان کے سامنے پہنچا تو کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ دو سائے ہلتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹھک کر ٹھہر گیا اور وہیں سے ڈپٹ کر آواز لگائی، کون ہے؟ بس ایک دم یہ دونوں نکل کر بھاگے۔ میں پیچھا نہ کرتا تو صاف نکل گئے تھے بلکہ یہ سالا تو نکل ہی گیا تھا۔ وہ تو راستے میں کوئی گڑھا آ گیا قلابازی کھا کر گرا اور میں نے فوراً دبوچ لیا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے ٹیٹوا گھٹنے سے دبا رکھا تھا نکل کر کیسے جاتا۔"

یہ تفصیل وہ اس سے پہلے بھی بتا چکا تھا۔ اور ہر بار کندھے اچکا کر سب کو اس طرح دیکھتا جیسے ابھی اکھاڑے سے کشتی مار کر آیا ہے۔ وہ بات ختم کرتا تو ایک دم تبصرہ شروع ہو جاتا۔

"یارو اندھیر ہے اندھیر۔ غضب خدا کا کس قدر بے غیرتی ہے۔"

"صورت تو دیکھو، اچھا خاصا بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے اور اس کے یہ کرتوت۔"

"بھگا کر لایا ہے۔"

"نہیں بھئی، یہ تو کوئی آوارہ عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"ابے تم کو یہ حرام کاری کرتے شرم نہیں آتی ــ جہنم میں جاؤ گے جہنم میں۔"

"تف ہے تمہاری اوقات پہ۔"

اس لعنت اور پھٹکار کے دوران پستہ قد محمد حسین بھی اپنی منمنی آواز میں بار بار کہتے۔ "اجی ان کو سنگسار کر دینا چاہیئے۔ اسلام میں زناکاروں کی یہی سزا ہے۔"

جب وہ کئی بار یہی بات کہہ چکے تو ایک بار میں نے جل کر کہا۔ "قبلہ پہلا پتھر کون مارے گا؟"

بولے "آپ ہی سے بسم اللہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

میں نے کہا جناب! پھانسی کے تختے پر چڑھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ زیادہ مجاہد معلوم ہوتے ہیں آپ ہی سے پہل ہو۔"

وہ ایک دم جوش میں آ گئے۔ "لیجئے میں ہی شروع کرتا ہوں۔" اور اُنھوں نے واقعی پتھر بھی اُٹھا لیا۔

میں نے ٹوکا۔ "پتھر اُٹھانے سے پہلے یہ بھی سوچ لیجئے کہ انجام کیا ہوگا۔ جیل کی کوٹھری اور پھانسی کا تختہ، بیوی رانڈ بیوہ۔ بچے یتیم۔"

اُنھوں نے فوراً پتھر چھوڑ دیئے ۔۔ مجھ کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولے ۔۔

"ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ آپ ہی کے ایسے بزدلوں نے تو مسلمانوں کو بدنام کیا ہے جبھی تو ہم اس حالت کو پہنچے ہیں کہ اس طرح کھلے عام حرامکاری ہو رہی ہے۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہتے، لیکن بیچ میں دوسرے لوگ بول پڑے۔ ہو بھی یہی رہا تھا۔ کوئی بات شروع کرتا، دوسرا بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا۔ ہر شخص اپنی ہانک رہا تھا، جتنے منہ اُتنی باتیں۔ اور وہ دونوں خاموش کھڑے ۔۔ خوف سے سہمے ہوئے، سکڑے ہوئے، دبکے ہوئے۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ اور ابھی یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ ان کو پولس کے حوالے کر دیا جائے مگر سوال کئی میل دور تھانے تک جانے کا تھا۔ اور اس سے ہر شخص کنی کاٹ رہا تھا۔ بعض کی تجویز تھی کہ مرد کا منہ کالا کیا جائے اور جوتے لگائے جائیں۔ عورت کی صرف چوٹی کاٹ دی جائے۔ کچھ اور بھی ایسی ہی دلچسپ سزائیں تجویز کی گئیں۔ بوڑھے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور جوان بڑوں کے ڈر سے خاموش تھے۔ ایک آدھ بار اُنھوں نے لقمہ دیا تو ان کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا۔ جن کے باپ موجود تھے اُنھوں نے لڑکوں کو تنبیہ کر کے گھر واپس بھیج دیا تھا۔

آخر بڑی بک بک جھک جھک کے بعد یہ طے پایا کہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے اور اس تفتیش کی روشنی

میں سزا تجویز کی جائے۔ لیکن اس طرح شبنم میں لوگ زیادہ کھڑے رہنے کے حق میں نہیں تھے کسی
مشورہ دیا کہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے پوچھ گچھ کی جائے ــ بات معقول تھی سب تیار ہو۔
لطف یہ کہ کوئی بھی گھر واپس جاتا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص کو دلچسپی تھی، کہ یہ تھی، اور ان میں
بھی شامل تھا۔

یہ تحریک چونکہ اکبر صاحب کی تھی۔ لہذا انھیں کے مکان میں، جو قریب ہی تھا، بیرونی برآمد
میں سب لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اندر سے کرسیاں آگئیں۔ بیٹھنا نصیب ہوا تو لوگوں میں کچھ معقولیت بھی
ہوئی۔ عورت کو ذرا دور ایک کونے میں بٹھا دیا گیا اور مرد سے سوالات کئے جانے لگے۔ محلے کے
ڈاکٹر مرزا صاحب نے ابتدا کی۔ اُنھوں نے کسی قدر نرمی سے پوچھا

"بھئی تم اس محلے کے تو معلوم نہیں ہوتے۔،، پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے
کیا کرتے ہو؟ اور یہ عورت کون ہے؟ بیوی تو معلوم نہیں ہوتی"

کسی نے بیچ میں لقمہ دیا۔" توبہ کیجیئے۔ بیوی کے ساتھ کوئی یہ نامعقول حرکت کرتا ہے"
صاحب کہ جن کا نام نامی اسم گرامی شریف احمد ہے، میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ا
نے ابھی نیا نیا مکان تعمیر کرایا ہے۔ کسی ایسی فرم میں ملازم ہیں جہاں دوسرے الاؤنسوں کے ساتھ
کا ایک مقررہ کرایہ بھی ملتا ہے۔ اپنے مکان میں رہنے کے باوجود دفتر سے اس کا کرایہ بھی وصول کر
ہیں۔ مکان بیوی کے نام ہے اس خوف سے کہ راز نہ کھل جائے۔ بیوی کے شوہر کے خانے میں
چھکّن خاں کا نام لکھوا دیا ہے۔ ویسے بڑے پرہیزگار آدمی ہیں۔ میں ہر روز ان کو پابندی کے ساتھ
کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

شریف احمد کا ذکر تو خواہ مخواہ بیچ میں آگیا۔ اب اس آدمی کا حال سُنئے، اس نے کسی سوال کا
جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ بہت اصرار کیا گیا تو عاجزی سے بولا " جناب غل
گئی، معاف کر دیجیئے۔ آپ سب سے معافی مانگتا ہوں، توبہ کرتا ہوں" اس نے دونوں ہاتھ

مستری جی جنہوں نے دونوں کو پکڑا تھا، فوراً بول پڑے۔ "معافی تو تم نے اسی وقت مجھ سے مانگی
، اس طرح کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتاؤ"
وہ آدمی پھر خاموش ہوگیا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک فیاض خاں نے اُٹھ کر اس کے منہ
یک زوردار تھپڑ لگایا اور گرج کر بولے "بتاتا ہے کہ سالے کے ایک اور لگاؤں"
وہ آبدیدہ ہوکر بولا۔ "آپ کیوں مار رہے ہیں۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے"
فیاض خاں پولس کے ریٹائرڈ انسپکٹر ہیں، ذرا نہ پسیجے۔ ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ وہ بلبلا کر
ا گال سہلانے لگا۔
فیاض خاں نے ہم سب کو اس طرح دادطلب نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھو
س طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایکبار پھر اپنا سوال دہرایا "اب تو بتا دو کہ
کون ہو، یہاں کیسے آئے، کیوں آئے؟"
فیاض خاں نے اس کو پھر ڈانٹا "سچ سچ بتا تا ورنہ مار مار کر سور بنا دوں گا"
وہ آدمی آہستہ سے بولا "میرا نام اسلم ہے دفتر میں کلرک ہوں"
پوچھا گیا "شادی ہوگئی تمہاری؟"
اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔
اکبر صاحب نے کہا "تو بھلے آدمی شادی کر کے گھر کیوں میں بسا لیتے۔ اس خرافات میں کیا
ھا ہے، عاقبت بھی خراب اور دنیا میں بھی منہ کالا"
وہ بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری ماں اور دوسرے رشتہ دار بھی یہی کہتے ہیں مگر بات
ہے......"
کسی نے بیچ میں بات کاٹ دی۔ "کیوں بکتا ہے۔ تم کو تو عورتوں کے ساتھ آوارہ گردی
ا مزہ آتا ہے"
وہ کہنے لگا "نہیں جناب یہ بات نہیں"

فیاض خاں نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔ "پھر کیا بات ہے سچ سچ بتا۔"
وہ بتانے لگا "دیکھئے ڈیڑھ سو تو کل میری تنخواہ ہے۔ اس میں پچاس روپے ہر مہینے ما
بھیجتا ہوں ان کا اور کوئی سہارا نہیں۔ باپ کا میرے انتقال ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں
کراچی میں معمولی سے معمولی مکان سو روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ ایک دوست کے ساتھ
نہ کسی طرح گزر بسر کر رہا ہوں۔"
پھر کوئی بیچ میں بول پڑا "اماں صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی معا
ہوتا ہے۔"
پوچھا گیا "اس عورت کو بھگا کر لائے ہو؟"
اس نے جواب دیا "جی نہیں۔"
کسی نے لقمہ دیا "تو پھر ... کا بھڑوا ہوگا۔" اس پر بعض لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔
ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا۔ "یہ عورت کون ہے؟"
وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "معلوم نہیں۔"
فیاض خاں پھر گرجے "ابے پھر جھوٹ بولا۔ لگاؤں دو ایک اور۔"
"میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔"
فیاض خاں کو اب تو جلال آ گیا۔ قبل اس کے وہ ہاتھ اُٹھائیں ڈاکٹر صاحب فوراً بول
پڑے "مگر بھئی، پھر یہ عورت تمہارے ساتھ یہاں کیسے آئی؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ اور دُرگ
بنے گی۔"

وہ کہنے لگا "دیکھئے بات یہ ہے کہ میں دس بجے کے قریب ایک دوست سے ملنے
اسٹیشن گیا تھا۔ وہ ریلوے میں کام کرتا ہے۔ وہیں یہ عورت مجھ کو مل گئی۔ اسٹیشن سے ذرا با
کرنٹ پائتھ پہ کھڑی کسی آدمی سے بات کر رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ آدمی ایک دم آگے بڑھ گ
میں اس کے پاس سے گزرا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ کو دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ میں آگے چلا گیا۔

جانے کیوں واپس آگیا۔"

کسی نے آوازہ کسا، "استاد یہ نہیں کہتے کہ ذرا ٹھرک لگانے کو جی چاہا۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اماں بات تو پوری سننے دو۔ ہاں بھئی تو پھر کیا ہوا۔" اب اس کی بات میں لوگوں کو دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔

وہ بتانے لگا۔ "میں نے قریب جا کر اس سے پوچھا! کہاں جاؤ گی؟ بولی! جہاں لے چلو" بس پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھ سے چالیس روپے مانگے اور بیس روپے پیشگی بھی لے لئے۔ ہم دیر تک ادھر اُدھر سڑکوں پر گھومتے رہے اور جب ایک پولیس والے کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو سوچا کہ اس طرح سڑکوں پر گھومنا خطرناک ہے۔ میں نے فوراً ایک رکشا ٹھہرائی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ مگر اس کو لے کر جاتا کہاں، دفتر کے ایک ملنے والے کے یہاں پہنچا تو اس نے گالیاں دے کر بھگا دیا۔ جس شخص کے ساتھ رہتا ہوں وہ بال بچّے دار آدمی ہے۔ اس کو ذرا بھی شبہ ہو جائے تو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دے۔"

سب بڑی دلچسپی کے ساتھ چپ چاپ اس کی باتیں سُن رہے تھے کہ اچانک اکبر صاحب بول پڑے "جب منہ ہی کالا کرنا تھا تو کسی ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا ہوتا۔ یہاں ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں۔"

وہ بولا "میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔"

کسی نے پوچھا "کتنے روپے تھے۔"

"پچاس!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہ ماں کو بھیجنے کے لئے تو نہیں تھے؟"

اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا "جی ہاں!"

بیک وقت کئی آوازیں مختلف سمتوں سے اُبھریں۔

"بھئی حد ہو گئی۔"

"لعنت ہے اس شخص پر۔"

"اس کو تو واقعی سزا ملنی چاہیئے۔"

کسی نے اونچی آواز سے اس کو مخاطب کر کے کہا۔ "بھئی تم آگے بتاؤ۔"

وہ بتانے لگا۔ "جب کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آئی تو ہم شہر سے نکل کر ادھر آگئے۔ یہاں آبادی بھی کم ہے اور سڑکوں پر اندھیرا بھی ہے۔ کیا کرتا بیس روپے تو وصول کرنا ہی تھے۔" وہ اب ذرا کھل کر بات کرنے لگا تھا۔

کسی نے برجستہ کہا "تو تم نے کئے وہ روپے وصول؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "رکشا کے کرایہ میں جو تین روپے دیئے تھے وہ بھی وصول نہیں ہوئے۔"

پستہ قد محمد حسین اس بات پر تڑپ کر رہ گئے۔ بگڑ کر بولے۔ "لاحول ولا قوۃ، کیا بے غیرتی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اور اس بے حیا کو دیکھیئے کہ کس بے شرمی کے ساتھ بات کر رہا ہے۔" کچھ اور لوگوں نے بھی لعنت ملامت شروع کر دی۔

رات بہت زیادہ ہو چکی تھی اور اس شخص کی بات میں بھی اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کی "میرا خیال ہے اب ان کو جانے دیا جائے۔ ان کو کافی سزا مل گئی۔"

شریف احمد کہنے لگے۔ "کیا بات کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ ان کو سزا کہاں ملی، ان کو ضرور کچھ نہ کچھ سزا ملنا چاہیئے تاکہ آئندہ عبرت ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "یہ رسوائی، یہ لعنت پھٹکار کچھ کم سزا ہے۔ بھلے آدمی ہوں گے تو آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔"

کسی نے اصرار کیا۔ "نہیں صاحب ان کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے، کہنے لگے۔ "پولیس کے حوالے کرنے سے کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ کچھ جرمانہ ہو جائے گا اور اخباروں میں خبر چھپ جائے گی کہ ایک نوجوان مرد اور عورت پبلک پلیس پر بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑے گئے اور جہاں تک تھانے جانے کا سوال ہے تو جناب

میں تو اب گھر جا کر سوؤں گا۔ میں تھانے وانے نہیں جاتا۔"

ذرا دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر شریف احمد کی آواز ابھری۔" مجھے تو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ شریف لوگوں کی آبادی ہے۔ یہ یہاں اس حرام کاری کے لئے کیوں آئے؟"

میں جو تمام عرصے خاموش بیٹھا رہا تھا۔ شامت اعمال بیچ میں بول پڑا۔" جناب میرے گھر کی دیوار کے پیچھے یہ ساری بیہودگی ہوئی مگر میں اب ان سے کیا کہوں نہ جانے رات کی تاریکی میں کس کس دیوار کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے۔ مجھے تو انھوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا، نہ میری نیند خراب کی، نہ میرے گھر میں نقب لگائی۔"

شریف احمد میری باتوں پر چڑ گئے۔ کہنے لگے" آپ کو ان سے بڑی ہمدردی معلوم ہوتی ہے ایسی ہی ہمدردی ہے تو اپنے گھر کے اندر بلا لیا ہوتا آپ نے۔"

ان کی اس بات پر میں جل کر رہ گیا لیکن اُنھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بڑے طنز کے ساتھ بولے "آیندہ بلا لیجیئے گا۔ ویسے یہ دھندا بُرا نہیں منافع ہی منافع ہے۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے زور کا ٹھٹھا مارا۔ میں نے اپنا پیر ذرا ڈھیلا کیا اور قبل اس کے کہ ان کا قہقہہ ختم ہو، جوتا اُتار کے بغیر کسی تمہید کے تڑا تڑ دو ان کی گنجی چندیا پر جما دیئے، تیسرا ہاتھ اُٹھایا تھا کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی جوتا چھین کر پھینک دیا۔ پھر کیا تھا وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کبھی وہ مجھ کو مارنے کے لئے جھپٹتے، کبھی میں ان پر لپکتا۔ کئی بار ہم گتھم گتھا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ہر بار لوگوں نے روک لیا۔ اچھی خاصی افراتفری مچ گئی۔

جب ذرا معاملہ ٹھنڈا ہوا تو پتہ چلا کہ اس ہنگامے میں وہ دونوں چپکے سے نکل بھاگے گر میں بیٹھے بٹھائے مشکل میں پھنس گیا۔ شریف احمد نے دوسرے ہی دن سٹی کورٹ میں مجسٹریٹ کے روبرو آٹھ آنے کے اسٹامپ پر حلف نامہ داخل کیا دو گواہ پیش کئے گئے، اور مار پیٹ کرنے کے الزام میں میرے خلاف قابل ضمانت وارنٹ جاری کرا دیئے۔ ابھی مقدمے کی پہلی پیشی ہے، جس میں ضمانت دے کر آیا ہوں۔ باقاعدہ سماعت بعد میں ہو گی۔ اب چونکہ یہ معاملہ عدالت کے روبرو ہے۔ لہذا یہ بات یہیں چھوڑے دیتا ہوں، کچھ اور کہوں گا تو توہین عدالت کے جرم میں دھر لیا جاؤں گا۔

۰۰

غلام الثقلین نقوی

لونگ والی

اس دن جب میں نے اپنے گھر کے تنگ صحن کی طرف (جو صحن کی ایک تحریف ہے، اس دُبلی پتلی عورت کو جاتے ہوئے دیکھا جو ایک لمحہ میری بیٹھک کے دروازے کے سامنے سے میلے اور گندے کپڑوں کا ہیولیٰ اور پسینے اور گوبر کی بُو کا بھبکا بن کر گزر گئی تھی اور اس کے سر پر اُپلوں کا بڑا سا ٹوکرا تھا، تو میرا ماتھا ٹھنک گیا کیوں کہ میں نے لونگ کا لشکارا دیکھ لیا تھا۔

چند لمحوں بعد مجھے اُپلوں کے فرش پر گر کر بکھرنے کی آواز آئی اور پھر "لا بی بی! جلدی سے پیسے لا، میں نے تیرا کہا مان لیا نہیں تو میں کسی کے گھر جا کر اُپلے نہیں پہنچاتی۔ جن کو ضرورت ہو لینے کے لئے میرے گھر آتے ہیں۔"

"تیری مہربانی ہے۔ اب تو ہی بتا میں تیرے ہاں کس کو اُپلے لانے کے لئے بھیجتی۔ تو دو چار آنے زیادہ لے لیا کر۔"

"دو چار آنوں کی بات نہیں بی بی۔ میں اس سے آنکھ بچا کر یہاں آئی ہوں، اسے پتہ لگ گیا تو میرے سر کو آئے گا۔ اس نے منع کر رکھا ہے۔"

"کیوں اس میں کیا حرج ہے؟" میری بیوی نے پوچھا "آخر تم اُپلے تھاپتی بھی ہو نا؛ اس کام سے وہ منع نہیں کرتا کیا ؟"

"گوجروں کی گائیں بھینسیں گھر کے ساتھ ہی تو بندھتی ہیں۔ مُنہ اندھیرے چلی جاتی

ہوں، دن چڑھنے سے پہلے گھر لوٹ آتی ہوں، کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ دیکھ بھی لے تو کون سی بڑی بات ہے۔ محنت مزدوری سے ذات میں کون سا فرق آتا ہے۔"

"پھر کسی کے گھر جا کر اُپلے پہنچا آنے ہی میں بے عزتی ہے۔"

"بی بی جلدی سے پیسے دے۔" اس نے بحث کو اچانک ختم کرتے ہوئے کہا۔

میں گھر آنے جانے والیوں کو دیکھنے کا عادی نہیں لیکن اُس دن جب وہ ڈیوڑھی میں سے گذری تو میں نے اسے غور سے دیکھ لیا۔ وہ سالونے رنگ اور تیکھے نقوش کی عورت تھی۔ اس کا قد لمبا تھا اور اس کی ستواں ناک پر اتنا بڑا سا لونگ تھا۔ وہ سَن سے گزر گئی تو میں زنان خانے میں چلا آیا۔ چھوٹے سے صحن میں ہر طرف اُپلے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بیوی سے پوچھا۔

"یہ لونگ والی کون تھی؟"

"اُپے دے کر گئی ہے۔" میری بیوی نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا اور بکھرے ہوئے اُپلے اکٹھے کرنے لگی۔

"بڑے ٹھسے کی عورت تھی۔"

"ہوگی۔ باتیں تو واقعی یوں کر رہی تھی جیسے کسی دیس کی رانی ہو۔ کس غرور سے اُپلے پھینکے جیسے میں مفت ہی میں تو لے رہی تھی۔ ذات کی کوڑھ کرلی۔۔۔"

مجھے اس ضرب المثل سے نفرت ہے۔ یوں بھی یہ بے محل تھی۔

میں نے ہنس کر کہا۔"اس کی ناک پر لونگ بھی تھا۔"

"لونگ!۔۔۔ آپ کو لونگ سے کیا؟"

"نہیں مجھے لونگ سے کچھ غرض نہیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ لونگ والیاں اکثر بڑی مغرور ہوتی ہیں۔ شکر ہے کہ تم لونگ نہیں پہنتیں۔"

"جبھی تو اُپلے اکٹھے کر رہی ہے۔ اس بستی میں اُپلے دینے والیاں بھی اپنے آپ کو بادشاہ زادیاں سمجھتی ہیں۔"

"کیوں کہ وہ لونگ پہنتی ہیں" میں نے کہا "اگر تم بھی . . . "

میری بیوی نے مجھے ایسی تیز تیز نگاہوں سے دیکھا کہ مجھے صحن سے ٹلتے ہی بنی۔

جس بستی میں میں رہتا تھا، شہر کی نسبت دیہات سے زیادہ قریب تھی اور پھر ماحول میں بھی دیہاتی عنصر غالب تھا اس لئے یہ ماحول مجھے پسند تھا۔ کھلے کھیت بھی قریب تھے اور ایک چھوٹی سی نہر بھی بہتی تھی۔ ارد گرد کئی کارخانے بھی تھے جہاں ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ بستی کے بے ترتیب پکّے مکانوں کے ساتھ سینکڑوں کچی جھونپڑیاں بھی شانے سے شانہ ملائے کھڑی تھیں اور وہ انہیں جھونپڑیوں میں سے ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔

میں نے اسے ایک دن سیر کرتے ہوئے اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ انہیں کھیتوں میں گوجروں کی گائیں بھینسیں چرتی بھی تھیں اور رین بسیرا بھی کرتی تھیں۔ اس کے سر پہ اُپلوں کا ٹوکرا تھا اور ناک پہ وہ لونگ بھی تھا جو صبح کی نرم نرم دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دور کچھ ہالی ہل بھی چلا رہے تھے۔ ابھی لونگ کا لشکارا انہیں پڑا تھا کیونکہ کسی ہالی نے ہل روک کر کان پہ ہاتھ نہیں رکھا تھا کہ کوئی ٹپّہ گائے۔

وہ میرے پاس سے گزرنے لگی تو میں ٹھٹھک گیا۔ اس نے مجھ پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں بے باکی نہیں تھی، عجیب سی بے نیازی تھی اور گردن کے خم میں بڑا غرور تھا، جیسے وہ دنیا بھر کو حقیر اور معمولی سمجھتی ہو۔

میں گھر آیا تو میری بیوی نے کہا "میں نے جمعدارنی سے کہا ہے، میں اب اُپلے اس سے نہیں لوں گی۔"

"کس سے ؟"

"اس سے جو اُس دن بڑا احسان جتا رہی تھی۔"

"کیوں ؟"

"میری مرضی۔"

"تم اس کے غرور سے چڑ گئی ہو۔"

"شاید یہی بات ہو گی۔ میں ایسی عورتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔" اس نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا۔

میں اپنی مطالعہ گاہ میں آ بیٹھا۔

آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ لونگ والیوں کی نفسیات پر کچھ لکھوں۔ لونگ سے وحشت کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ لونگ پہن کر عورت کے حسن میں تو نہیں نسوانی وقار میں ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُپلے بیچ کر بھی اپنی خودداری کو ٹھیس نہیں آنے دیتی۔ لونگ اور انا کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن لونگ ہے ایک داہیات زیور جس سے صدیوں کی جہالت اور قدامت کا اظہار ہوتا ہے۔ 'لونگ' ایک لشکارا۔ . .

اور میری سوچ کا سلسلہ یکدم منقطع ہو گیا۔

"بی بی سلام۔"

"سلام۔" میری بیوی نے اپنے جواب میں انتہائی بے نیازی کا ثبوت دیا۔

"میں نے کہا بی بی سے مِل آؤں۔"

"آج اُپلے تھاپنے نہیں گئی تم؟"

"گئی تھی ... کیوں؟ ... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"یونہی۔ . . . ."

"اپنی مرضی ہے . . . جب جی چاہا چلی جاتی ہوں . . . کسی کی نوکری تو نہیں کی۔ شبھو لوگجر کچھ کہتا ہے تو کھری کھری سُن بھی لیتا ہے . . . میں کسی کی دھونس نہیں مانتی بی بی۔"

"آج کہیں میلہ گھومنے جا رہی ہو؟"

"نہیں تو۔ . . ."

"کپڑے تو ویسے ہی پہن رکھے ہیں۔ بڑی سج دھج سے آئی ہو۔"

"اپنی مرضی ہے ۔ ۔ ۔ کسی سے مانگ کے تو نہیں لائی۔ اپنے ہیں۔ جب جی چاہا پہن لیا پر بی بی تونے اتنا بھی نہ کہا کہ بیٹھ جاؤ فاخراں اور لو کم ٹاک شروع کر دی۔"

"تو تمہارا نام فاخراں ہے؟"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا بیٹھ جاؤ فاخراں۔"

بعد ازاں اِدھر اُدھر کے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ ملاقات ناکام ہو گئی ہے۔ البتہ مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اس کا خاوند کسی کارخانے میں ملازم ہے، ان کی جھونپڑی کا دس روپے کرایہ ہے اور اب سُنا ہے کہ جھونپڑیاں گرائی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ پکّے مکان بن رہے ہیں۔

"پکّے مکان کا کرایہ بہت ہو گا، تم کیا کرو گے؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"اللہ مالک ہے ۔ ۔ ۔" پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "گاؤں چلے جائیں گے۔"

"گاؤں میں کون ہے تمہارا؟"

"باپ ہے، ماں ہے، بھائی ہیں، سبھی ہیں پر بی بی تونے یہ بات کیوں پوچھی؟"

اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

"یونہی ۔ ۔ ۔" میری بیوی نے کہا۔

ملاقات ختم ہوئی تو وہ پھر میرے مطالعہ گاہ کے دروازے کے سامنے سے گزری۔ ایک بچہ اس کی گود میں تھا دوسرا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے ساڑھے چھ گز کا تہمد باندھ رکھا تھا، کپڑا معمولی پاپلین کا تھا لیکن اس کا رنگ بڑا شوخ تھا۔ پاؤں میں بڑی سُبک اور نازک سی جھلمل جوتی تھی اور قمیص کا ستاری ریشمی کپڑا جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ دوپٹے کے لہریئے میں ابرق کی جھلک تھی۔ اس نے ایک لمحے

کے لیے مجھے رُک کر دیکھا۔ انہیں بے نیاز سی نگاہوں کے ساتھ جن کی چمک میں سُرمے کی سیاہی بھی گھلی ملی تھی اور اَنا کی خود شناسی بھی جیسے ساری دنیا اس کی ٹھوکر میں ہو۔ اس کے دُھلے دُھلے سانولے چہرے پہ جوانی کا نکھار بھی تھا اور لونگ کے لشکارے میں نسوانی وجاہت کا حُسن بھی۔

"لونگ کا لشکارا۔"

میں نے دیکھا کہ صبح کے نرم نیز اُجالے میں ایک گاؤں بیدار ہو رہا ہے اور کچی ٹیڑھی بینگی گلیاں آنکھیں مل مل کر صبح کا سواگت کر رہی ہیں۔ کچے گھروں کے آنگنوں سے جہاں بکائن کی شاخوں میں چڑیاں چوں چوں کر رہی ہیں۔ مدھانیوں کی گھُمک گوں گھُمک گوں کا نغمہ اٹھ رہا ہے۔ ہالی اپنے ہل لے کر کھیتوں میں پہنچ چکے ہیں۔ جہاں دو دن پہلے اساڑھ کی پہلی بارش ہوئی تھی اور گیلی مٹی سے ابھی تک خوشبو اُٹھ رہی ہے۔ ہوائیں اوس کی نمی رچی ہوئی ہے اور بھُربھُری مٹی میں ہل کے پھالے تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ کھیتوں پر دھوپ کی چادر بچھ گئی ہے۔ دھوپ جو تیز بھی ہے اور دُھلی دُھلی بے داغ اور شفاف بھی اور جس کی تمازت میں زندگی کی گرم گرم تازگی بھی ہے۔ گاؤں کی عورتیں اپنے سروں پر لسّی کے مٹکے رکھے اور رنگین دسترخوانوں میں گھی میں تلی روٹیاں لپیٹے کھیتوں کی طرف جا رہی ہیں۔ پگڈنڈیاں زندہ ہو گئی ہیں کیوں کہ ان پر محبت کرنے والیوں کے باوفا قدم گُل کترتے چلے جا رہے ہیں۔

ایک پگڈنڈی پر لونگ کا لشکارا پڑا تو ایک ہالی کا ہل رُک گیا۔ اس نے گورے اور چینے کو چھیڑا تو ہل کا پھالا زمین میں تیرتا ہوا پگڈنڈی تک پہنچ گیا۔ اس نے گورے اور چینے کو پچکار کر ٹھہرایا تو ذرا سی پگڈنڈی کو گورے اور چینے کی تھوتھنیوں نے یوں روک لیا جیسے وہ اس کے گذرنے پر اس سے کوئی نہایت راز کی بات کہنا چاہتے ہوں۔ وہ ابھی کچھ فاصلے پر تھی کہ اس نے کان پہ ہاتھ رکھ لیا، وہ چند قدم دور تھی کہ اس نے اونچی تان اُڑائی۔

"تیرے لونگ دا پیا لشکارا۔ تے ہالیاں نے ہل ڈک لے۔"

اس کی چال میں ذراسی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ ایک قدم لحظے بھر کے لئے رُکا پھر اس نے گردن اونچی کی اور دوسرا قدم بڑے غرور سے اُٹھ گیا۔ وہ بچے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی گورے اور چھینے کے پاس آکر رُک گئی۔ اس نے پگڈنڈی سے اُتر کر آگے بڑھنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی جیسے کہنا چاہتی ہو "تیرے گانے کی میٹھی تان نے میرا راستہ کیوں روکا ہے؟" اس کی نگاہ میں آگ بھری ہوئی تھی پر آگ میں جلن نہیں تھی۔

"چل گورے! اوئے چھینے! تو کن خیالوں میں کھوگیا؟ تیرا کون ہے جو چوری کا چھنا لے کر آئے گا تیرے لئے۔ دیکھ! پیاس کے مارے میرے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ پر اس دنیا میں پیاسوں کو کون پوچھتا ہے۔" اور تیزی سے گھومتے ہوئے چھینے کی گیلی گیلی تھوتھنی اس کے دامن سے چھو گئی تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "چھینے تجھے اس گستاخی کی سزا ضرور ملے گی۔"

وہ ہل چلاتے چلاتے اسے مڑکر دیکھتا رہا اور وہ دور درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں غائب ہوگئی تو اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور میرے تخیل کی اُڑان یہاں پہنچ کر تھم گئی۔

"ہوسکتا ہے شادی سے پہلے اس نے لونگ پہنا بھی نہ ہو۔" میری منطقی حس بولی۔

"تو خواہ مخواہ ایک رنگین خواب میں کھوکر رہ گیا۔" میرے تخیل نے جھنجھلا کر کہا۔

لیکن اس کے باوجود میرے ذہن کے اُفق پر دور بہت دور ایک کہانی کا سایہ لہرا رہا تھا۔

اس شام میں حسب معمول سیر کے لئے نکلا تو گیلی زمین پر گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی اور مزدور کارخانوں سے لوٹ رہے تھے۔ میں نے اُسے اپنی کچی جھونپڑی کے آنگن میں کھڑے دیکھا۔ مزدوروں کی ایک ٹولی سے ایک نوجوان جدا ہوا جس کا چہرہ پسینے اور تیل کی سیاہی میں لت پت تھا۔ اس کے ملیشیا کے کپڑے تیل اور گریس میں لتھڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے دن بھر کی مشقت اور تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی گرمی تھی اور اس کی انا ایک عجیب سے جذبے کی آنچ میں پگھل رہ گئی تھی

لیکن تھکے تھکے مزدور نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

"دروازے پر کیوں کھڑی ہو؟" اس نے کچھ خشونت سے پوچھا۔

"تیرے لئے۔۔۔۔"

"روٹی پکی ہے؟"

"نہیں آٹا گوندھا رکھا ہے۔"

"مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ دونوں جھونپڑی کے اندر چلے گئے اور میری کہانی کا ہیولیٰ از خود فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

"میں ایسی معمولی حقیر زندگی کے ساکن جوہڑ کی تہہ سے کہانی کا آبدار موتی کہاں سے نکالوں؟" میں نے کھلے کھیتوں میں پہنچ کر مایوسی کے عالم میں سوچا۔ "پر اس کی مسکراہٹ کی گرمی میں کوئی بات ضرور تھی۔"

جب میں سیر سے لوٹا تو رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔

اس کی جھونپڑی کے سامنے دو تین مزدور کھڑے تھے اور وہ جھونپڑی کے آنگن میں کھڑی ان کا راستہ روکے ہوئے تھی۔

"بھابھی!" ایک نوجوان نے پوچھا "خیر دین کہاں ہے؟"

"مجھے کیا پتہ؟" اُس نے کہا۔

"ابھی ابھی تو وہ کام سے فارغ ہو کر گھر آیا تھا' خیر دین۔۔۔ اوئے خیرے۔۔۔؟"

"آج وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔" اس نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"وہ کوئی بچہ ہے بھابھی کہ ہم اسے اغوا کر کے لے جائیں گے؟ اسے باہر تو آنے دو۔"

"کہہ جو دیا نہیں جائے گا۔" اس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"اوئے خیرے باہر آ۔ اندر گرمی اور اُمس میں کیوں مر رہا ہے؟ بھابھی کھا تو نہیں جائیگی"

نہیں۔ مرد بن مرد۔"

خیر دین اس للکار پر جھونپڑی سے باہر نکل آیا ——— اس نے فاتحاں کو کندھوں سے پکڑ کر ایک طرف ہٹایا اور کہا "عجیب عورت ہے۔ کہیں آنے جانے ہی نہیں دیتی۔"

ایک مزدور نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا "میرے شیر! آج تم عورت سے مات کھا جاتے تو ساری عمر زن مزدور کہلاتے۔"

میں اندھیرے کی وجہ سے لونگ والے چہرے پر شکست کے آثار نہ دیکھ سکا لیکن جب میں نے اس شکست کا ذکر اپنی بیوی سے کیا تو وہ خوش نہ ہوئی۔ اس نے کہا "سارے مرد اپنی من مانی کرتے ہیں۔ جمعدارنی سچ کہہ رہی تھی کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"اچھا نہیں؟ کیوں؟"

"جمعدارنی کہہ رہی تھی، وہ جو کچھ کماتا ہے یار دوستوں میں بیٹھ کر اُڑا دیتا ہے۔ وہ بیچار
اُپلے نہ بیچے تو گھر کا گذارہ کیسے چلے؟"

"تم تو اس کی طرفداری کر رہی ہو۔ میرا خیال ہے اب تم اُپلے بھی اُسی سے لوگی۔"

"ہاں . . . ایک آدھ سے لئے تھے پر وہ گیلے بھی تھے اور ان میں آدھی مٹی بھی ملی ہوئی

"تو گویا تم نے شکست مان لی؟"

"وہ زبان کی تیز تو ضرور ہے لیکن سودے کی بڑی کھری ہے۔ اُپلوں میں مٹی نہیں ملاتی۔"

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ جمعدارنی نے آتے ہی کہا "بڑی شہزادی بنی پھرتی تھی۔ کل اس
خاوند نے اسے دھواں دھوں پیٹ ڈالا۔"

"کیوں؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"مرد ذات ہر وقت گھر میں گھس کر بیٹھا رہے تو اُکتا جاتا ہے بی بی۔"

"تو نے تو کہا تھا کہ وہ بھی اچھا آدمی نہیں۔"

"اچھا ہو یا بُرا مرد تو ہے اور بی بی! عورت ذات کا بھرم ماں باپ سر پہ ہوں تو

رہ سکتا ہے"۔

"اس کے ماں باپ مر گئے ہیں؟"

"نہیں..... ہاں..... یہی سمجھ لو مر ہی گئے ہیں" جمعدارنی نے مدھم آواز میں کہا۔

میں نے آواز پر کان لگا دیئے۔

"کیا مطلب؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"یہ کلموہی ماں باپ کو چھوڑ کر اس کے ساتھ شہر میں بھاگ آئی"۔

میری بیوی یقیناً حیران ہوئی ہوگی لیکن مجھے میرے تخیل کی پرواز کا جواز مل گیا۔

"اب وہ اپنا کیا بھگت رہی ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے وہ۔ جی چاہے تو کام پر چلا جاتا ہے جو کچھ کماتا ہے خرچ کر ڈالتا ہے۔ جمعدار بتا رہا تھا کہ جوا بھی کھیلتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بیچاری پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بی بی"

"ٹھیک ہے پر اس کی اکڑ فوں تو ویسے کی ویسے ہے"۔

"بی بی! مانو یا نہ مانو ہے وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی"۔

"ہوگی..... اچھا تم اپنا کام شروع کرو" میری بیوی نے ذرا سا چڑ کر کہا۔

مجھے گفتگو کے اس اچانک خاتمے پر افسوس ہوا۔ "ہوگی" ان دو لفظوں نے میرے افسانے کا محل گرا دیا تھا جیسے وہ ریت کی بنیاد پر استوار ہو رہا ہو۔ شاید جمعدارنی کچھ اور بھی بتاتی پر اب تو قصہ ختم تھا۔ میں نے اپنے تخیل سے کام لینا چاہا لیکن وہ بھی لٹ سے مس نہ ہوا۔ میں نے ہتھیار ڈال دئے اور مایوس ہو گیا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکا کہ خیر دین ایک خوش باش جوان ہے جسے دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر تاش کھیلنے کا شوق ہے۔ کبھی کبھار دو چار پیسوں کا جوا بھی ہو جاتا ہوگا اور بیچاری فاخراں اس پر بھی ناراض تھی کیوں کہ عورت محبت کے معاملے میں بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ پھر اس نے خیر دین کے لئے بہت بڑی قربانی دی تھی اور اسے اس کے صلے میں صرف خیر دین درکار تھا اور وہ بھی اس کی گرفت سے نکل رہا تھا۔ زندگی ان چھوٹے چھوٹے المیوں

تمہیں۔ مرد بن مرد۔"

خیر دین اس للکار پر جھونپڑی سے باہر نکل آیا —— اس نے فاتحراں کو کندھوں سے پکڑ کر ایک طرف ہٹایا اور کہا "عجیب عورت ہے۔ کہیں آنے جانے ہی نہیں دیتی۔"

ایک مزدور نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا "میرے شیر! آج تم عورت سے مات کھا جاتے تو ساری عمر زن مزدور کہلاتے۔"

میں اندھیرے کی وجہ سے لونگ والے چہرے پر شکست کے آثار نہ دیکھ سکا لیکن جب میں نے اس شکست کا ذکر اپنی بیوی سے کیا تو وہ خوش نہ ہوئی۔ اس نے کہا "سارے مرد اپنی من مانی کرتے ہیں۔ جمعدارنی سچ کہہ رہی تھی کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"اچھا نہیں، کیوں؟"

"جمعدارنی کہہ رہی تھی، وہ جو کچھ کماتا ہے یار دوستوں میں بیٹھ کر اُڑا دیتا ہے۔ وہ بیچاری اُپلے نہ بیچے تو گھر کا گذارہ کیسے چلے؟"

"تم تو اس کی طرف داری کر رہی ہو۔ میرا خیال ہے اب تم اُپلے بھی اُسی سے لوگی۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ایک اور سے لئے تھے پر وہ گیلے بھی تھے اور ان میں آدھی مٹی بھی ملی ہوئی تھی۔"

"تو گویا تم نے شکست مان لی؟"

"وہ زبان کی تیز تو ضرور ہے لیکن سودے کی بڑی کھری ہے۔ اُپلوں میں مٹی نہیں ملاتی۔"

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ جمعدارنی نے آتے ہی کہا۔ "بڑی شہزادی بنی پھرتی تھی۔ کل اس کے خاوند نے اسے دھواں دھوں پیٹ ڈالا۔"

"کیوں؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"مرد ذات ہر وقت گھر میں گھس کر بیٹھا رہے تو اُکتا جاتا ہے بی بی۔"

"تو نے تو کہا تھا کہ وہ بھی اچھا آدمی نہیں۔"

"اچھا ہو یا بُرا مرد تو ہے اور بی بی! عورت ذات کا بھرم ماں باپ سر پہ ہوں تو قائم

رہ سکتا ہے۔"

"اس کے ماں باپ مر گئے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ یہی سمجھ لو مرہی گئے ہیں۔" جمعدارنی نے مدھم آواز میں کہا۔

میں نے آواز پر کان لگا دیئے۔

"کیا مطلب؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"یہ کلموہی ماں باپ کو چھوڑ کر اس کے ساتھ شہر میں بھاگ آئی۔"

میری بیوی یقیناً حیران ہوئی ہو گی لیکن مجھے میرے تخیل کی پرواز کا جواز مل گیا۔

"اب وہ اپنا کیا بھگت رہی ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے وہ۔ جی چاہے تو کام پر چلا جاتا ہے جو کچھ کماتا ہے خرچ کر ڈالتا ہے۔ جمعدار بتا رہا تھا کہ جوا بھی کھیلتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بیچاری پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بی بی۔"

"ٹھیک ہے پر اس کی اکڑفوں تو ویسے کی ویسے ہے۔"

"بی بی! مانو یا نہ مانو ہے وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی۔"

"ہو گی۔۔۔۔ اچھا تم اپنا کام شروع کرو۔" میری بیوی نے ذرا سا چڑ کر کہا۔

مجھے گفتگو کے اس اچانک خاتمے پر افسوس ہوا۔ "ہو گی" ان دو لفظوں نے میرے افسانے کا محل گرا دیا تھا جیسے وہ ریت کی بنیاد پر استوار ہو رہا ہو۔ شاید جمعدارنی کچھ اور بھی بتاتی پر اب تو قصہ ختم تھا۔ میں نے اپنے تخیل سے کام لینا چاہا لیکن وہ بھی لٹو سے مس نہ ہوا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مایوس ہو گیا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکا کہ خیر دین ایک خوش باش جوان ہے جسے دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر تاش کھیلنے کا شوق ہے۔ کبھی کبھار دو چار پیسیوں کا جوا بھی ہو جاتا ہوگا اور یہ بیچاری فاخراں اس پر بھی ناراض تھی کیوں کہ عورت محبت کے معاملے میں بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ پھر اس نے خیرو کے لئے بہت بڑی قربانی دی تھی اور اسے اس کے صلے میں صرف خیرو درکار تھا اور وہ بھی اس کی گرفت سے نکل رہا تھا۔ زندگی ان چھوٹے چھوٹے المیوں

تمہیں۔ مرد بن مرد۔"

خیر دین اس للکار پر جھونپڑی سے باہر نکل آیا ـــــ اس نے فاتحاں کو کندھوں سے پکڑ کر ایک طرف ہٹایا اور کہا "عجیب عورت ہے۔ کہیں آنے جانے ہی نہیں دیتی۔"

ایک مزدور نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا "میرے شیر! آج تم عورت سے مات کھا جاتے تو ساری عمر زن مزدور کہلاتے۔"

میں اندھیرے کی وجہ سے لونگ والے چہرے پر شکست کے آثار نہ دیکھ سکا لیکن جب میں نے اس شکست کا ذکر اپنی بیوی سے کیا تو وہ خوش نہ ہوئی۔ اس نے کہا "سارے مرد اپنی من مانی کرتے ہیں۔ جمعدارنی سچ کہہ رہی تھی کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"اچھا نہیں، کیوں؟"

"جمعدارنی کہہ رہی تھی، وہ جو کچھ کماتا ہے یار دوستوں میں بیٹھ کر اڑا دیتا ہے۔ وہ بیچاری اُپلے نہ بیچے تو گھر کا گزارہ کیسے چلے؟"

"تم تو اس کی طرف داری کر رہی ہو۔ میرا خیال ہے اب تم اُپلے بھی اُسی سے لو گی۔"

"ہاں . . . . ایک اور سے لئے تھے پر وہ گیلے بھی تھے اور ان میں آدھی مٹی بھی ملی ہوئی تھی۔"

"تو گویا تم نے شکست مان لی؟"

"وہ زبان کی تیز تو ضرور ہے لیکن سودے کی بڑی کھری ہے۔ اُپلوں میں مٹی نہیں ملاتی۔"

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ جمعدارنی نے آتے ہی کہا "بڑی شہزادی بنی پھرتی تھی۔ کل اس کے خاوند نے اسے دھواں دھوں پیٹ ڈالا۔"

"کیوں؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"مرد ذات ہر وقت گھر میں گھس کر بیٹھا رہے تو اُکتا جاتا ہے بی بی۔"

"تو نے تو کہا تھا کہ وہ بھی اچھا آدمی نہیں۔"

"اچھا ہو یا بُرا مرد تو ہے اور بی بی! عورت ذات کا بھرم ماں باپ سر پہ ہوں تو قائم

رہ سکتا ہے۔"

"اس کے ماں باپ مر گئے ہیں؟"

"نہیں... ہاں... یہی سمجھو مر ہی گئے ہیں" جمعدارنی نے مدھم آواز میں کہا۔

میں نے آواز پر کان لگا دیئے۔

"کیا مطلب؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"یہ کلموہی ماں باپ کو چھوڑ کر اس کے ساتھ شہر میں بھاگ آئی۔"

میری بیوی یقیناً حیران ہوئی ہوگی لیکن مجھے میرے تخیل کی پرواز کا جواز مل گیا۔

"اب وہ اپنا کیا بھگت رہی ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے وہ۔ جی چاہے تو کام پر چلا جاتا ہے جو کچھ کماتا ہے خرچ کر ڈالتا ہے۔ جمعدار بتا رہا تھا کہ جوا بھی کھیلتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بیچاری پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بی بی۔"

"ٹھیک ہے پر اس کی اکڑ فوں تو ویسے کی ویسے ہے۔"

"بی بی! مانو یا نہ مانو ہے وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی۔"

"ہوگی... اچھا تم اپنا کام شروع کرو" میری بیوی نے ذرا سا چڑ کر کہا۔

مجھے گفتگو کے اس اچانک خاتمے پر افسوس ہوا۔ "ہوگی" ان دو لفظوں نے میرے افسانے کا محل گرا دیا تھا جیسے وہ ریت کی بنیاد پر استوار ہو رہا ہو۔ شاید جمعدارنی کچھ اور بھی بتاتی پر اب تو قصہ ختم تھا۔ میں نے اپنے تخیل سے کام لینا چاہا لیکن وہ بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے ہتھیار ڈال دئے اور مایوس ہو گیا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکا کہ خیر دین ایک خوش باش جوان ہے جسے دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر تاش کھیلنے کا شوق ہے۔ کبھی کبھار دو چار پیسوں کا جوا بھی ہو جاتا ہوگا اور بیچاری فاخراں اس پر بھی ناراض تھی کیوں کہ عورت محبت کے معاملے میں بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ پھر اس نے خیرو کے لئے بہت بڑی قربانی دی تھی اور اسے اس کے صلے میں صرف خیرو درکار تھا اور وہ بھی اس کی گرفت سے نکل رہا تھا۔ زندگی ان چھوٹے چھوٹے المیوں

سے بھری پڑی ہے۔ اگر اس کی ناک پر لونگ نہ ہوتا تو شاید میں اُس کی زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ یہاں تک کبھی نہ پہنچتا۔ میں اس ایلیے کی داستان کیا لکھوں۔

گزشتہ اتوار کو بڑے انتظار کے بعد آسمان ابر آلود ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی تو جان میں جان آ گئی۔ میں گھر سے نکل کر گلی میں آ گیا جہاں گرم گرم دھول بارش کے ٹھنڈے چھینٹوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں رچی ہوئی باریک دھول آنکھوں میں پڑی تو آگے جانے کو جی نہ چاہا تاہم سگریٹ ختم تھے اس لئے میں گلی کی نکڑ تک جا پہونچا۔ دینو کی دکان کے تھڑے پہ تاش کی محفل جمی ہوئی تھی۔ لوگوں نے مجھے بڑی شک آلود نگاہوں سے دیکھا ایک نے جلدی جلدی سامنے پڑے آنوں پیسوں کے ڈھیر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ایک نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا۔ وہ ابھی ابھی کسی بات پر مُسکرایا تھا کیوں کہ ابھی تک اس کا وہ دانت چمک رہا تھا جس پر سونا مڑھا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ خیرو تھا۔ ایک نامعلوم گاؤں کے ایک ایسے رومان کا ہیرو جو گاؤں اور شہر کی تہذیب کے سنگم پر دم توڑ رہا تھا۔ وہ کلّے ٹھلّے کا جوان تھا۔ اس کا چہرہ صاف تھا۔ باریک مونچھوں کی تیز نوکوں اور جمی جمی قلموں کے باعث وہ کسی پنجابی فلم کا ہیرو لگ رہا تھا۔ اس نے ململ کا صاف ستھرا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ابھی تک مُسکراہٹ کے ستارے ناچ رہے تھے اور یہ مُسکراہٹ اتنی معصوم تھی کہ مجھے اس پہ شبنم کی بوند کا گمان ہوا۔ خنک لرزتی ہوئی حسّاس بوند!

اور میرا جی چاہا کہ میں اس پر ایک افسانہ لکھ ہی دوں۔

میں نے سگریٹ لئے اور گھر چلا آیا۔ پھر بارش کے پہلے چھینٹے پڑے تو میں نے قلم ہاتھ میں لیا اور لکھنا شروع کر دیا۔

"وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ خیرو اور فاخراں۔ فاخراں بچپن ہی سے بڑی نٹ کھٹ تھی۔ وہ یوں چلتی جیسے ساری دھرتی کی رانی ہو۔ ان کے آنگنوں کے درمیان ایک کچی دیوار حائل تھی۔ فاخراں کے باپ نے پکّا مکان بنایا تو یہ دیوار بھی پکّی ہو گئی اور

اس میں کوئی روزن باقی نہ رہا لیکن دلوں کے درمیان کوئی پکی دیوار۔ ۔ ۔"

"بی بی! مالو نہ مالو نہ ہے وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی۔" جمعدارنی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

بڑے گھر کی بیٹی۔

میں نے قلم میز پر رکھ دیا، بارش کی ایک بوچھار آئی، تڑ تڑ بوندیں پڑیں اور گرم مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھی تو لُو سے جلے اور پسینے میں شرابور جسم میں پھریری سی آئی۔ میں نے افسانے کے آغاز کو قلم زد کر کے نئے سرے سے لکھا۔ "وہ ایک بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ اپنے چھوٹے سے گاؤں کا نمبردار تھا۔ خیرو کا باپ اس کا مزارع تھا۔ وہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ دُبلی پتلی، سانولی سلونی شریر لاڈلی لڑکی جو بڑی نٹ کھٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی چمک تھی اور اس کے انگ انگ میں پارا بھرا ہوا تھا۔ وہ دھرتی کی رانی تھی۔ چلتی تو اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے۔ یوں لگتا جیسے وہ ہوا میں تیرتی چلی جا رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔

بارش یکدم بند ہو گئی۔ ایک سنّاٹا سا چھا گیا۔ پھر گلی کے نکڑ پر ایک شور اُٹھا اور یوں معلوم ہوا جیسے کچھ لوگ بھاگ رہے ہوں۔ میں نے سمجھا بارش کی وجہ سے جو لوگ دُکانوں کے چھجے کے نیچے جمع ہو گئے تھے، وہ بارش کے بند ہوتے ہی گھروں کو بھاگ نکلے ہیں کہ کہیں اُنہیں دوسری بوچھار نہ آ لے اور میں بھی دوسری بوچھار کے انتظار میں قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا اور افسانے کے تار و پود کا خیالی سلسلہ سلجھانے لگا۔ کہانی کا پورا خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ اب اس میں صرف رنگ بھرنا باقی رہ گیا تھا۔ انجام بھی واضح تھا۔ ایک بڑے گھر کی بیٹی نے محبت کی قربان گاہ پر سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ اس سے اچھا انجام اور کون سا ہو سکتا ہے بھلا؟ میرا خیال تھا کہ میں اس افسانے میں لونگ کا بالکل ذکر نہیں کروں گا۔

"دینے کو کئی بار سمجھایا تھا کہ اپنی دُکان پر ایسے ویسے لوگوں کو بیٹھنے نہ دیا کرے

اس نے کان نہ دھرا۔" ایک آواز گلی میں سے آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ دو آدمی گذر رہے تھے۔

"دکان چل نکلی تھی۔"

"یار مخبری کس نے کی؟"

"کیا پتہ؟ وہ فرشتے چپ چاپ نازل ہوئے۔"

"آوازیں دور سے دور تر ہوتی گئیں میں صرف اتنا جان سکا کہ ڈبنو کی دکان پر کچھ ہو ــ۔

یکایک میرے ذہن میں کھٹکا سا ہوا۔ "بیچارا خیرو پکڑا گیا۔ جوئے کے الزام بس دھر لیا گیا۔"

"بڑے گھر کی بیٹی اب کیا کرے گی؟" میں نے سوچا۔ "یہ اچھا نہیں ہوا۔"

اب افسانے کو جاری رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اتنے رومان بھرے افسانے کا ایسا ذلیل انجام تو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مطلع بھی صاف ہو گیا تھا۔ دھوپ نکلی تو زمین کے سینے سے گرم گرم بخارات اُٹھے اور میں پسینے میں نہا گیا۔ طبیعت یکایک بدمزہ ہو گئی۔ تب جمعدارنی نے کھٹ سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا اور میرے دروازے کے سامنے سے تیز تیز گذر گئی۔ وہ یقیناً کوئی اہم خبر سنانے کے لئے بیتاب تھی۔ وہ صحن میں داخل ہوتے ہی بول اُٹھی۔ "بی بی اسے پولیس لے گئی۔"

"کسے؟" میری بیوی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بے چاری فاخراں کے گھر والے کو۔"

جب جھنگن اتنی بڑی خبر کا بوجھ اُتار کر چلی گئی تو میں نے بیوی سے کہا۔ "بے چاری لونگ والی شکست کھا گئی۔"

"شکست! . . . کس سے؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"کس سے؟ . نجانے کس سے ؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

دو چار دن بعد کی بات ہے کہ ایک عورت سائے کی طرح میری بیٹھک کے سامنے سے گذر گئی ــــــــ وہ کچھ عرصہ صحن میں بیٹھی رہی اور دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرتی رہی۔ میں نے گفتگو کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ لوٹی تو سر نہوڑائے ہوئے گذر گئی۔ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ یوں بھی میں گھر آنے جانے والیوں کو دیکھنے کا عادی نہیں۔

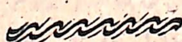
" فاخراں بے چاری آئی تھی کہ بی بی اُپلوں کی ضرورت تو نہیں تمہیں ؟" میری بیوی نے بیٹھک میں آ کر کہا۔

" فاخراں ؟ . . . میں تو اسے پہچان نہ سکا۔"

" جمعدارنی سچ کہہ رہی تھی۔ وہ ہے کسی بڑے گھر کی بیٹی۔ وہ نکھٹو ضمانت پر رہا ہو کر آ گیا ہے، پر بے چاری کا لونگ بک گیا ہے۔"

" لونگ !" میں اپنی آواز کی حیرت پر خود حیران ہو گیا۔

" جبھی تو میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس کی ناک پر لونگ نہیں تھا اور اس کی شخصیت بدل گئی تھی جیسے ایک لونگ کے نہ ہونے سے وہ زمانے بھر سے شکست کھا گئی ہو۔" میں نے کہا۔



عطیہ پروین

کڑوا گھونٹ

"ہائے اللہ" کہہ کر اچھو اس طرح تڑپی کہ چھوٹے میاں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اچھو نے زور لگایا اور مچھلی کی طرح پھسل کر فرش پر گری۔ جب تک چھوٹے میاں سنبھلیں وہ کمرے سے باہر نکل چکی تھی۔

چھوٹے میاں اپنے شکار کو یوں ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر کھسیانے ہو گئے۔ میز پر رکھے پانی کے گلاس سے انھوں نے چند گھونٹ پانی پیا پھر گلاس کو دور کونے میں اچھال دیا۔ پانی ان کے قرینے سے رکھے ہوئے چمک دار جوتوں پہ گرا اور گلاس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے ــــ کچھ منٹ پہلے اسی ایک گلاس پانی کے بہانے انھوں نے اچھو کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

سولہ برس کی صحت مند گھرے سلونے رنگ کی اچھو دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہوش و حواس پر چھا بیٹھی تھی ــــ چھوٹے میاں ایسا نفاست پسند آدمی اور اچھو جیسی گندے کپڑوں اور میلے ہاتھ پیروں والی لڑکی۔ ان کو خود اپنی پسند پہ گھن معلوم ہوتی مگر وہ اپنے دل اور دل سے زیادہ اُبلتے ہوئے جذباتی دھارے سے مجبور رہتے جو اچھو کے توانا جسم، بھرے بھرے چہرے اور مستانہ چال پر لوٹ پڑتا تھا۔

کتنے حیلوں بہانوں کے بعد آج وہ اس کو اپنے کمرے تک لانے میں کامیاب

ہوئے تھے۔ اماں بی اور باجی چچا میاں کے یہاں میلاد میں گئی تھیں، بوا بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اچھو گھر پر ابا میاں اور چھوٹے میاں کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ گھنٹہ بھر تک چھوٹے میاں کو اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ اپنے بھائی کلو کے ساتھ باورچی خانے کا کام نمٹاتی رہی پھر ابا میاں کو کھانا کھلانے چلی گئی، وہاں سے لوٹی تو ڈھیر بھر میلے کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔ چھوٹے میاں بجلی جیسی تیزی سے پھڑکتی ہوئی اچھو کو دیکھتے رہے اور جھومتے رہے۔ چھ برس سے وہ علی گڈھ میں تھے، اتنے عرصہ میں جانے کتنی لڑکیوں سے ان کی دوستی ہوئی تھی، کتنے ہی گلاب کے پھول ان کی گود میں مہکے تھے پر ان کو یہ بے چینی اور یہ بے قراری نہ ہوئی تھی۔ اٹھائیس برس کے خوش قامت، خوش شکل چھوٹے میاں جنس مخالف کے لئے بے حد کشش رکھتے تھے، اسی کشش کی بدولت ان گنت مخملی جسموں کا لمس وہ جی بھر کر محسوس کر چکے تھے۔ ان کو کوئی دقت نہ ہوئی تھی، لیکن یہ گنوار، جاہل، گندی اچھو تو ایسا فولاد ثابت ہوئی تھی کہ نہ جھکتی تھی نہ ٹوٹتی تھی۔ چھوٹے میاں زخمی سانپ کی طرح بل کھاتے، بڑبڑاتے برآمدے میں نکل آئے۔

"اُلّو کی پٹھی! بڑی پارسا بنتی ہے۔ ماں، نانی سب ہی اس دہلیز پر جوانی نذر چڑھاتی رہیں اور یہ سالی بڑی عزت والی بن کر چلی ہے۔" اُنھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ اچھو کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ تیزی سے بڑھے کہ اس کو اپنی کوٹھری میں ہی گرفتار کر لیں لیکن سامنے سے ابا میاں آ گئے۔ ان کے ہمراہ منشی جی بھی تھے۔ وہ سر جھکا کر پھر اپنے کمرے میں گھس گئے۔

چھوٹے میاں کے اس غصے سے بے خبر اچھو اپنی کوٹھری میں بند تھر تھر کانپ رہی اور رو رہی تھی۔

یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔ چھوٹے میاں کئی بار اس کو اکیلا پا کر شکاری بلّے کی مانند دبوچ چکے تھے لیکن ہر بار وہ پھڑک کر ان کی سخت دم گھونٹنے والی گرفت سے نکل بھاگی تھی۔ اب تو وہ چھوٹے میاں سے اس درجہ خوف زدہ ہو چکی تھی کہ ان کے سائے سے بھی

بھا گئی تھی ۔ اُف ! وہ ان کی سُرخ ڈورے پڑی بڑی بڑی آنکھیں اور پُر اسرار مسکراہٹ

وہ اکیلے ہوتے تو اجو کو دیکھ کر اس طرح مسکراتے کہ ڈر لگنے کے ساتھ ساتھ

کو بڑی شرم آتی۔ عجیب سی کراہیت محسوس ہوتی ۔ دیکھنے میں تو ایسے سیدھے ! ایسے پُروقار

کہ عزّت کرنے کو سر آپ سے آپ ہی جُھک جائے ۔ اماں بی کے سامنے ایسے بے تعلق نظر

جیسے آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ ہو مگر اکیلے میں وہ کھل کھیلتے کہ توبہ بھلی ۔ ظاہری لبادہ

اُتار کر اپنے اصلی جامے میں آجاتے ۔ ایسا پھُسلا پھُسلا کر بات کرتے ۔ ایسا ایسا ہنستے

جیسے اس کے آپ برابر کے ہوں یا اس سے کمتر درجے کے ہوں ۔ وہ دقار وہ تمکنت

جانے کہاں چلا جاتا ۔ اجو کے سراپا کو ایسے دیکھتے جیسے کوئی قصائی بکری کو دیکھتا ہے اور

ان کی یہ نگاہیں اجو کو تیر کی طرح اپنے بدن میں چُبھتی معلوم ہوتیں ۔

اس سے پہلے وہ چھوٹے میاں کی دل سے عزّت کرتی تھی' بالکل بڑے سرکار کی طرح

ان سے خوف کھاتی ۔ اس وقت جب کہ وہ مریل چھپکلی جیسی لونڈیا تھی چھوٹے میاں آنکھ اٹھا کر

بھی اس کی سمت نہ دیکھتے' اکثر ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے اور اپنے کمرے میں تو قدم کبھی نہ رکھنے

دیتے حالانکہ اس کو اُجلے اُجلے خوش بودار چھوٹے میاں بڑے اچھے لگتے ۔ بھولے بھٹکے وہ

ان کے قریب ہو جاتی تو اس کا دماغ مہک جاتا' جانے کون کون سی خوشبوئیں لگاتے ۔

مگر اجو کو اپنے پاس دیکھ کر ان کا پارہ گرم ہو جاتا ۔

"اری گندی کتیا چل چل' دور ہٹ ! معاذ اللہ اس کم بخت کے پاس سے مچھلی جیسی

بساندھ آتی ہے ۔"

لیکن اب ! اب تو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ چھوٹے میاں کو نہ اس کے بدن سے

مچھلی کی بساندھ آتی نہ اس کے گندے کپڑوں سے گھن لگتی ۔ اب تو وہ ہر دم یہی چاہتے

تھے کہ اجو ان کے آس پاس بیٹھی رہے' ذرا ذرا سی بات پر آواز دیا کرتے ۔ پہلے اپنا سارا کام

کلو سے لیتے تھے اب کوشش یہی کرتے کہ چھوٹی بڑی ہر ضرورت اجو پوری کرے اور ان

ہر صدا پر اچو یوں سہم جاتی جیسے کوئی چھوٹی سی چڑیا شکرے کی آواز سُن کر دبک جاتی ہے۔

اب تو چھوٹے میاں اس کے لئے چھوٹے موٹے تحفے بھی لانے لگے تھے۔ شروع میں ان کی اس عنایت سے وہ بے حد شاد ہوئی تھی۔ جن چیزوں کو وہ حسرت سے دیکھتی اور صرف سوچ کر رہ جاتی تھی، چھوٹے میاں نے وہ سب اس کی گود میں لا ڈالی تھیں۔ جب بھی وہ آتے ان کے سوٹ کیس میں اچو کے لئے سوغات ضرور ہوتی۔ لکس کی مہکتی ہوئی بٹیاں، رنگین پھندنے والی چوٹیاں، جگ مگ کرتے ٹاپس، چم چم کرتے موتی کے ہار ـــــ اچو کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں۔ وہ ندیدوں کی طرح ایک ایک چیز دیکھتی تو چھوٹے میاں کہتے۔

"گھور کیوں رہی ہو اچو۔ یہ سب تمہارے ہی واسطے لایا ہوں، مگر سُنو اماں بی یا باجی کو نہ بتانا!"

"کیوں میاں؟" اچو کی بڑی بڑی آنکھیں سوالیہ انداز میں ان کو تاکتیں تو وہ ان رس بھرے کٹوروں میں اپنی نظریں ڈبو کر مسکراتے۔

"نری بدھو ہے تو! اری وہ لوگ تجھے بھی ماریں گی اور میری جان بھی کھا جائیں گی۔ بس لے بھی لے جلدی سے! اور ہاں سُن! یہ سب پہن کر مجھے ضرور دکھانا، بڑی اچھی لگے گی۔"

اچو کا ننھا سا دل خوشبوؤں کے حوض میں غوطے کھانے لگتا۔ وہ چھوٹے میاں کی پُر شوق نگاہوں سے بے خبر جلدی جلدی ساری چیزیں اپنے آنچل میں باندھتی اور جھپاک سے باہر نکل جاتی۔

اماں بی اور باجی سے تو خیر یہ بہانہ چل جاتا کہ یہ سب سامان کلوا لایا ہے مگر اس کی ماں اس راز میں شریک تھی۔ اس کے نزدیک یہ تحفے تحائف کوئی انوکھی چیز نہ تھے۔ اپنی جوانی میں وہ خود بڑے سرکار اور چھوٹے سرکار سے اس طرح کے تحفے لے چکی تھی اور ان کے ٹکے ٹکے کی چیزوں کے عوض اپنی انمول شے بھینٹ چڑھا چکی تھی ـــــ!

نہ چڑھاتی تو کیا کرتی، سو پشت سے یہی خدمت ہوتی چلی آئی تھی سرکاروں کی! اچھو کی ماں نے یہیں آنکھ کھولی تھی، اچھو کی نانی یہیں پروان چڑھی تھی، پرنانی نے اسی چوکھٹ پہ پہلا قدم اٹھایا تھا۔ کھانے، کپڑے اور ڈلی پان کے اوپر جوانیاں اور بڑھاپا سب نے یہیں بتایا تھا۔ نام کے لئے کسی ناکارہ سے آدمی کو پکڑ کر نکاح کر دیا جاتا پھر بیوی کے ساتھ وہ بھی یہیں رہ پڑتا۔ بیوی اندر کا کام کرتی میاں سرکار کا حقہ بھرتا، اُگالدان اٹھاتا اور پھاٹک کے اونچے موںڈھے پہ بیٹھا دربانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔

یہی اس حویلی میں اب تک ہو رہا تھا۔ دنیا بدل گئی تھی۔ سرکار بس نام کے سرکار رہ گئے تھے۔ جاگیر چھن چکی تھی، اگلے ٹھاٹ باٹ خواب ہو چکے تھے پھر بھی پرانی شان اور آن باقی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پرانے نمک خواروں کی نسل بھی اپنے آقا پہ نچھاور ہوا کرتی تھی۔ اچھو کی ماں اب بوڑھی ہو چلی تھی اس کی جگہ اچھو سنبھال رہی تھی اور اماں بی اس کے لئے کوئی گھر جوائی لڑکا تلاش کر رہی تھیں۔

چھوٹے میاں کافی عرصے سے یہ تحفے تحائف لا رہے تھے اور اس دن کے منتظر تھے جب یہ کچی کلی ان کے معطر اور گداز بستر پہ بکھر جانے والی تھی۔ انھوں نے جی بھر کر اچھو کے نخرے اُٹھائے۔ بُندے اور ہار کے علاوہ کھانے پینے کے لئے بھی روپیہ دو روپیہ دیتے رہے، چوری چھپے مٹھائی پھل لا لا کر اس کو دیتے رہے۔ اس کے جواب میں ان کو صرف اچھو کے گرم بدن کا تھوڑا بہت لمس ہی میسر ہو سکا۔ جب بھی وہ اپنی حد سے نکلنا چاہتے اچھو تیر کی مانند نکل بھاگا کرتی۔ اِدھر انھوں نے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ عنقریب ان کی شادی ہونے والی تھی۔ کومل بدن والی، دودھ جیسی اُجلی اور ملائی کی طرح نرم شاہدہ کے ساتھ! شاہدہ! جو ان کی کلاس فیلو تھی، ان کی پسند تھی۔ بھلا اچھو کا اور اس کا کیا مقابلہ۔ جیسے مخمل کے برابر مارکین رکھ دی جائے یا جیسے گلاب کے پھول کے مقابلے پر لواڑی کا پھول آ جائے۔ شاہدہ اپنی جگہ پر تھی، اچھو اپنی جگہ پر۔ چھوٹے میاں

شاہدہ کی جگہ سے مطمئن تھے لیکن اس نواڑی پھول کو سونگھے بغیر بھی وہ بے قرار ہو رہے تھے۔ گلاب کو گریبان میں سجانے سے پہلے وہ نواڑی کے پھول کو ایک ذرا دیر کے لئے اپنی جیب میں رکھ لینا چاہتے تھے۔ جہاں باپ دادا کی ساری روایتوں کو نبھا رہے تھے وہاں اس روایت کو کیوں ترک کرتے جو خود ان کو دل سے پسند تھی۔

اس بار وہ اپنی منگنی کرنے آئے تھے اور یہ ارادہ کر کے آئے تھے کہ تڑپ تڑپ کر نکل جانے والی اس مچھلی کو جال میں پھنسا کر ہی چھوڑیں گے۔

اس کم بخت پر ان کے کتنے پیسے خرچ ہو گئے تھے۔ اس خرچ میں اچھو کی ماں کی ڈلی تمبا کو بھی شامل تھی۔ انھوں نے ہر ہفتہ بوا کو ایک روپیہ پاندان کے نام سے دینا شروع کیا تھا۔ بوا ان کی بخشش پر جہاں عمر و اقبال کی ترقی کی ہزاروں دعائیں نچھاور کرتی تھیں وہاں ان کے لبوں پر ایک "تلخ مسکراہٹ" بھی پھیل جاتی تھی۔

اب تو چھوٹے میاں دن میں ایک آدھ بار ان کی کوٹھری میں بھی قدم رنجہ فرمانے لگے تھے۔

حویلی کی پشت پر بڑے سے احاطے کے ایک کونے پر ایک دروازے کی لمبی سی کوٹھری جس کے آگے بڑا سا چھپر پڑا تھا چھوٹے میاں کے لئے عبادت کدہ بن گئی تھی۔ صبح شام جس کی زیارت ان کے لئے ضروری ہو گئی تھی۔

پلنگ پر دھلی ہوئی صاف چادر بچھا کر بوا ان کے پاؤں دبانے بیٹھ جاتیں تو ان کا جی چاہتا کہیں۔

"بوا ــــ تم ان سخت اور سوکھے ہاتھوں سے میرا نرم نرم گوشت مسلنا معاف کرو ــــ یہ خدمت تم اچھو کے سپرد کر دو، وہ اپنے گرم گرم ہاتھوں کا سارا زور میری پنڈلیوں پر نکال دے۔"

مگر وہ کہتے کہتے رہ جاتے۔ ان کی نگاہ اچھو کی طرف اٹھتی جو میلے دوپٹہ میں اپنی

سرکش جوانی کو چھپانے کی کوشش میں پریشان ہوتی۔

"بوا — آخر یہ آجو اس قدر گندی کیوں رہتی ہے؟ میں نے اس روز جو کپڑے بنوائے ہیں کیوں نہیں پہناتیں اس بھتنی کو؟"

ایک روز اُنھوں نے بوا کی ٹیڑھی میڑھی بس کھٹی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ آجو حویلی میں جھاڑو لگا کر آئی تھی۔ کپڑوں اور بالوں پر گرد جمی تھی۔ سلونے رُخسار دمک رہے تھے اوپری ہونٹ کے باریک روئیں پسینہ میں شرابور تھے۔

"اے میاں اللہ اس سرکار کو قیامت تک سلامت رکھے، ہر وقت تو باورچی خانے میں کام رہتا ہے، جو کپڑے پہنے گی ذری دیر میں صافی بن جائیں گے۔"

"تو روز دھو ڈالا کرے نا!" اور وہ سر سے پیر تک آجو کو گھور کر بولے۔ "دیکھ ری اب اتنی گندی نظر نہ آنا۔"

"میاں رہتی دنیا تک آپ کا ظہور باقی رہے، اب تو آپ کی منگنی کے دن ہی آپ کا لایا جوڑا پہنے گی۔ اسی نیک گھڑی کے لئے اور بھی سینت سینت کے رکھا ہے ورنہ یہ پھوہڑ اسی وقت بھگت ڈالتی۔"

منگنی کے دن آجو چھوٹے میاں کا بنوایا ہوا چاکلیٹی لیڈی ہملٹن کا پاجامہ جالی کا دوپٹہ اور کسا کسایا سفید جمپر ڈالے چمکتی پھر رہی تھی۔ چھوٹے میاں نے اس کو ہمیشہ اُجڑا اور گندا ہی دیکھا تھا۔ یہ دُھلی دُھلی نکھری نکھری آجو انھیں ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ جی چاہ رہا تھا کلیجہ میں بھرلیں۔ چھ گز کا پاجامہ آجو کے سنبھالے نہ سنبھل رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے پائینچے پکڑے کام کر رہی تھی۔ کانوں میں ٹاپس جگمگا رہے تھے، گلے میں چمکتا ہوا ہار تھا۔ گول گول کلائیوں میں شہانے تھے جو اماں بی نے صاحبزادے کی منگنی کی خوشی میں پہنوائے تھے۔

چھوٹے میاں دل تھام کر رہ گئے۔ نواڑی کا یہ پھول تو اس وقت ہزاروں گلاب کے پھولوں کو مات کئے دے رہا تھا۔ ذرہ آفتاب بن گیا تھا۔

"اری اچھو! ذرا میرے نہانے کا سامان تو ٹھیک کر دے!" انھوں نے اچانک اس کی پشت پر پہنچ کر کہا۔ اچھو صحن میں بچھے تخت پر چاندنی لگا رہی تھی چونک کر مڑی تو چھوٹے میاں کو اس کی بے ربط سانسوں کی آنچ بڑی بھلی معلوم ہوئی۔

"میاں! ایں تو یہ سب کام کر رہی ہوں، کلوا خالی ہے۔"

"کلوا پان لینے گیا ہے۔" باجی شامیانے میں غباروں کی قطاریں باندھتی ہوئی بولیں۔ "جا جلدی سے ٹھیک کر دے، بھائی جان کو اب تیار ہو جانا چاہیئے۔ محفل جمع ہو رہی ہے۔"

"بس ابھی تیار ہوا جاتا ہوں۔ چل جلدی سے شاباش!" چھوٹے میاں نے مسکرا کر اچھو کو چمکارا۔

اچھو کا دم ہی نکل گیا مگر مرتی کیا نہ کرتی جانا ہی پڑا۔ جلدی جلدی صابن، تولیہ کپڑے اور چپل رکھ کر غسل خانے سے نکلی ہی تھی کہ چھوٹے میاں سر پر سوار ہو گئے۔

"بڑے غضب کی لگ رہی ہو اچھو! خدا کی قسم پہچانی نہیں جاتیں، مگر ایک کسر رہ گئی ہے لو یہ عطر بھی لگا لو!" چھوٹے میاں نے عطر حنا کی شیشی اٹھا کر اس کو دکھائی۔

"نہیں میاں! اماں خفا ہوں گی!" اچھو دروازے کی طرف کھسکی۔

"خفا نہیں ہوں گی، میں کہہ دوں گا کہ میں نے دیا تھا۔ لاؤ میں لگا دوں!"

"نہیں میاں، نہیں! اللہ رہنے دیجئے!" اچھو ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر گھگھیائی۔

"ارے آ بھی! اب زیادہ نخرے نہ دکھا۔ اس بار میں تیرے لئے چاندی کے جھمکے لاؤں گا۔ میری شادی پر پہننا۔" چھوٹے میاں کی آنکھوں سے شراب ابل رہی تھی۔

"مجھے جانے دیجئے! ابھی سرکار پکاریں گی!" اچھو کونے میں گھس کر بولی۔

"چلی جانا، میں تمھیں کھا نہ جاؤں گا۔ آؤ ایک ذرا دم لے لو!" چھوٹے میاں اپنے شفاف بستر کی طرف اشارہ کر کے مسکرائے۔

اچھو کواڑ اور دیوار کی درمیانی جگہ میں مکڑی کی طرح چپک گئی۔

"دیکھو کپڑے گندے ہو جائیں گے!" چھوٹے میاں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی بانہہ

کھینچی۔ گرم گرم نرم نرم گول بانہہ جس کے گرد سفید جمپر کی تنگ آستین کھبی ہوئی تھی۔ اس نے زور لگایا ہاتھ چھڑانے کے لئے چھوٹے میاں نے زور لگایا اس کو کھینچنے کے لئے۔ دوسرے لمحہ وہ کسی ننھی منی چڑیا کے مانند چھوٹے میاں کی بانہوں کے تنگ حلقے میں کپکپا رہی تھی۔

"ٹھہرو! دروازہ بند کر دوں تو ایک چیز دکھاؤں جو میں اس بار تمہارے لئے لایا ہوں"۔

چھوٹے میاں نے ایک ہاتھ اَچو کے گرد کس کر دوسرے ہاتھ سے بڑھ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ اَچو نے اپنی ساری قوت کے ساتھ جھٹکا دیا اور پھسل کر چھوٹے میاں کی گرفت سے نکل کر بجلی کی طرح تڑپی۔ "رُک تو" چھوٹے میاں لپکے لیکن وہ چشم زدن میں دروازہ اور برآمدہ پار کر کے صحن میں غائب ہو گئی۔

چھوٹے میاں ہاتھ مل کر اور دانت پیس کر رہ گئے۔ دل میں ایک کھٹک لئے سینہ میں ایک طوفان دبائے وہ نہائے دھوئے، کپڑے بدلے، خوشبو لگائی، چھپاک بنے دوستوں کے حلقے میں ہنسی مذاق کرتے رہے۔ بھری محفل میں سسرال سے آئی مٹھائی چکھ کر ہیرے کی جگمگاتی انگوٹھی پہنی۔ گھر میں آکر اماں بی اور دوسری بزرگ خواتین کو جھک جھک کر آداب کئے۔ رشتہ کی بہنوں میں گھر کر نیگ کے روپے بانٹے۔ سب ہی کچھ کیا لیکن ان کی آنکھیں اَچو کو کھوجتی رہیں۔ وہ کہیں نہ تھی۔ جانے کس کونے کھدرے میں جا مری تھی۔ دل ہی دل میں انھوں نے اس سرکش لڑکی کو نہایت گندی سی گالی دی اور بظاہر بے خیالی میں ٹہلتے ہوئے باورچی خانے کی طرف نکل گئے۔

بوا پسینہ میں شرابور دھوئیں اور بے شمار برتنوں کے بیچ بڑی بڑی چکی کے پاٹ جیسی چپاتیاں جھل رہی تھیں —— بڑی بھاری سل کے آگے کلوا بیٹھا ڈھیروں دھنیا مرچ پیس رہا تھا۔ دونا ونیں پلاؤ دم کرنے میں مصروف تھیں۔

"بوا! کھانے میں کتنی دیر ہے؟" انھوں نے دہلیز پر کھڑے ہو کر باورچی خانے کے کونے کونے میں نظر دوڑائی۔

"بس میاں! آپ تشریف لے چلئے، ایک ذرا چاول میں کسر ہے اور تو سب تیار ہے

سرکار کے لئے کھانا جاچکا ہے۔ آپ کے لئے بس ذری دیر میں لاتی ہوں۔"

بوا کے ہاتھوں میں اور پھرتی آگئی ـــ! اجو کے متعلق پوچھنا مناسب نہ سمجھ چھوٹے میاں چپ چاپ لیکن خوشی سے اچھلتے دل کو لئے سب کی نظر بچا کر احاطے میں نکل گئے میدان صاف تھا۔ بوا یا کلوا کے جلدی فرصت پانے کی امید نہ تھی۔

بڑی ہی احتیاط اور آہستگی کے ساتھ انھوں نے بوا کی کوٹھری کے بھڑے ہوئے دروازے کھولے۔

مایوسی! شدید مایوسی! کوٹھری کسی مفلس کی جیب کی طرح خالی تھی" پھر کہاں گئی آخر؟" وہ بڑبڑا کر باہر نکل آئے۔

باجی دو چار اور لڑکیوں کے ساتھ کھانے لئے بڑا سا دسترخوان لگا رہی تھیں۔ چھوٹے میاں دھیرے سے بولے۔

"باجی۔ سر میں بڑا درد ہے۔ تھوڑی سی لونگ پسوا کر بھیج دو تو لگا لوں۔ شاید آرام مل جائے۔"

"ہائے میں ہی پیس دیتی مگر یہاں سے ہٹ بھی تو نہیں سکتی ـــ اری اختر۔۔۔!" انھوں نے رشتہ کی ایک بہن کو پکارا ہی تھا کہ چھوٹے میاں نے ٹوک دیا۔

"ان کو کیوں تکلیف دو گی باجی۔ اجو کہاں مرگئی۔ باورچی خانے میں بھی نہیں ہے!"

"اجو۔ اجو! اری او اجو!" باجی چنگھاڑیں تو برآمدے میں مرادآبادی پایوں والے نواڑی پلنگ پر بیٹھی بیٹھی اماں بی نے ٹوکا۔

"کیوں گلا پھاڑے ڈالتی ہو بی! باہر آواز جائے گی۔ اجو تمہارے ابا میاں کا کھانا لے کر گئی ہے!"

بڑے سرکار ہمیشہ اکیلے ہی کھانا کھاتے تھے۔ اب تو خیر مصاحبین بھی نہ رہے تھے لیکن جب بڑے سرکار کو شہد کے چھتے کی اور آدمیوں کو مکھیوں کی مثال دی جاتی

تھی تب بھی سرکار کھانا اکیلے ہی نوش فرماتے تھے۔

پہلے اچو کی ماں یاشکورن جو اچو کی خالہ تھی اور عین جوانی میں مرگئی تھی یہ خدمت انجام دیتی تھیں۔ اماں بی کو گھر کے جنجال سے کہاں فرصت تھی کہ گھنٹہ بھر تک میاں کو کھانا کھلانے کی ڈیوٹی بجاتیں ۔۔ یوں بھی اس گھر کا پشتینی دستور تھا کہ میاں لوگوں کو کھانا لونڈیاں ہی کھلاتے تھے۔ کھانے کے بعد میاں قیلولہ کرنے جاتے تو خس کی خنک مہکتی ٹٹیوں کے خوش گوار اندھیرے میں کوئی نہ کوئی خادمہ گھنٹہ دو گھنٹہ پاؤں دباتی۔ بیگمات سے ملاقات تو رات کے ایک دو بجے ہی ہوا کرتی تھی ۔۔ اماں بی نے ان روایتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔

سرکار کو کھانا اب اچو کھلانے لگی تھی لیکن یہ عجیب بات تھی کہ وہ اچو سے پاؤں نہیں دبواتے تھے۔ کھانے کے فوراً بعد اس کو فرصت مل جاتی۔ سرکار کا حقہ بھی کلوا تازہ کرتا تھا۔ اماں بی کا خیال تھا کہ یہ سن کا تقاضا ہے۔

چھوٹے میاں اچو کی اس خدمت سے واقف تھے۔ وہ بھول ہی گئے تھے کہ یہ ابا میاں کے کھانے کا وقت ہے۔

"اچو کو فرصت ہو جائے تو لونگ پسوا کر بھیج دینا۔"

"ہاں ہاں بالکل۔ تم چلو بس ابھی بھیجتی ہوں۔ ذرا سا تیل بھی دبوا لینا بھیا! ابھی تمہیں دو بجے رات تک جاگنا پڑے گا۔" باجی بولیں۔

چھوٹے میاں کے دل کا کنول پھر شگفتہ ہو گیا۔ وحشی ہرنی کو جال میں لانے کے لئے ابھی بہت سے راستے تھے۔ وہ ہلکے سُروں میں سیٹی پر

"تو حقیقت میں حسیں اور میں جواں"

گاتے غیر ارادی طور پر ابا میاں کے کمرے کی طرف نکل گئے۔

اچو برتنوں کی سینی اٹھائے ہوئے کمرے سے باہر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سُرخ تھیں اور اُبھرے ہوئے گالوں پہ آنسوؤں کے نشان صاف چمک رہے تھے۔

بھورے بالوں کی کئی منتشر لٹیں پسینہ میں بھیگ کر پیشانی پر جم گئی تھیں۔ بھیگی پلکیں اٹھا کر اس نے چھوٹے میاں کو دیکھا تو وہ ٹھٹھک گئے۔

"یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو"

زیرِ لب وہ گنگنا اٹھے — ! ایک شبہ نے ان کے دل میں سر ابھارا۔

تو کیا ابا میاں آج اپنی باسی جوانی کے ابال کے آگے مجبور ہو گئے ! ان کا لقمۂ تر ان کے واسطے تبرک بن گیا۔ نیاز کی مٹھائی ہو گیا۔ لیکن . . . . لیکن وہ اتنی آسانی سے یہ نعمت چھوڑنے والے نہ تھے۔

"اچھو ! ذرا جلدی سے تھوڑی سی لونگ پیس کر گرم کر لاؤ، سر میں درد ہو رہا ہے اور ہاں باجی سے چمیلی کا تیل بھی لیتی آنا۔"

اچھو نے دھیرے سے کہا۔

"اچھا میاں !" اور تیزی سے چلی گئی۔ چھوٹے میاں کی نظریں اس مست مورنی کا تعاقب کر کے واپس ہوئیں تو ابا میاں کا پُر وقار چہرہ سامنے آ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ گڑبڑا گئے۔

"شبو بیٹے ! ذرا یہاں تو آنا !" ابا میاں نے کہا اور فوراً کمرے میں مڑ گئے۔

سہمے سہمے چھوٹے میاں نے ان کی تقلید کی۔ وہ ابا میاں کا بہت ادب کرتے تھے۔

اس کمرے میں آنے کا اتفاق بہت ہی کم ہوتا تھا۔ کسی کی ہمت ہی نہ تھی کہ سرکار کی خواب گاہ میں قدم رکھتا۔

اپنے گدیلے آرام دہ بستر پر بیٹھتے ہوئے ابا میاں نے ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

پاس پڑی آرام کرسی پر بیٹھ کر چھوٹے میاں نے سر اُٹھا کر سوالیہ انداز میں باپ کی طرف دیکھا۔ وہ اضطراری کیفیت میں حقّے کے کش پر کش کھینچ رہے تھے۔

کئی سکنڈ انتظار کرنے کے بعد ہمت کر کے چھوٹے میاں بولے۔

"ابا میاں! کیا حکم ہے؟"

"حکم نہیں! ایک گذارش ہے!" ابا میاں کے لبوں پر ایک تلخ لیکن شرمندہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"جی!!" چھوٹے میاں گھبرا گئے۔

"آج ابھی تمہاری شکایت کر رہی تھی۔" ابا میاں نے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ سے کہا پھر اپنے پیروں سے مخاطب ہو گئے۔ "تم نے جس روش پر چلنا چاہا وہ نئی نہیں ہے بیٹے، اس پر تمہارے باپ دادا بھی چل چکے ہیں۔ اگر لاعلم ہوتا تو اس گناہ کو یوں ہی نظر انداز کر دیتا جیسے کہ میرے باپ نے میرے لئے کیا تھا لیکن جان بوجھ کر تو ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ بہن بھائی میں وہ رشتہ قائم ہوتے دیکھا جائے جس کے گنہگار ہم سب ہیں۔۔۔۔۔!"

"بہن۔۔۔ کون بہن؟۔۔۔۔!" پسینہ میں شرابور چھوٹے میاں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ابا میاں نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔

"ہاں بیٹا! آج ہم دونوں کی عزت ہے، ہم دونوں کی آبرو ہے! اس سے بھی تمہارا وہی رشتہ ہے جو آصفہ سے اور تم سے ہے۔ آصفہ کی طرح آج بھی میری لڑکی ہے۔"

چھوٹے میاں برف کا تودہ بن گئے۔



مارچ ۱۹۵۳ سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہونے والا باوقار جریدہ

ماہنامہ تحریک دہلی

اب نئی آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے

نئے پروگرام کے مطابق رسالہ بالتصویر ہو گیا ہے اور اس کی ضخامت بھی بڑھ گئی ہے۔

کچھ نئے فیچر بھی شروع کئے گئے ہیں اور گوپال متل صاحب "کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی"

کے

عنوان سے قسط وار اپنی یادداشتیں بھی لکھ رہے ہیں۔ ہر مہینے اور بھی بہت سی نئی

نئی دلچسپیاں اور ادب اور سیاست کے تازہ ترین میلانات پر بے لاگ تبصرے۔

آج ہی سالانہ قیمت آٹھ روپے منی آرڈر سے بھیج کر رسالے کے سالانہ خریداروں میں

اپنا نام شامل کرالیں۔ نمونہ طلب کرنے والے حضرات ۷۵ پیسے کے ڈاک کے ٹکٹ ارسال کریں۔

ایجنٹ حضرات خط لکھ کر ایجنسی کی شرائط اور دوسری تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔

مینیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی

اردو کے جواں سال مزاح نگار

مجتبیٰ حسین

کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ

تکلف برطرف

قیمت:- تین روپے

مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں۔ ان کے مزاح میں وہ تندی اور بیباکی نہیں جو طبیعت کو مکدر کر دیتی ہے بلکہ وہ لطافت اور رچاؤ ہے جو پڑھنے والے کو کبھی زیرِ لب تبسم اور کبھی بلند آہنگ قہقہہ کی دعوت دیتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کا فن اردو کے مزاحیہ ادب میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے

— کرشن چندر

ملنے کا پتہ:- ادبی ٹرسٹ بک اسٹال۔ کنارا بینک بلڈنگ۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد

علیم مسرور

ذکرِ غالب

رقص میں ہیں شعر و انداز و بیان و فکر و فن　　اضطراب شوق نے آراستہ کی انجمن
کیفیت گلریز ہے الفاظ ہیں گل پیرہن　　چاہیئے کچھ اور بھی آرائشِ حسن سخن
روحِ رنگ و بو کو اک ہم رنگ قالب چاہیئے
ذکر غالب ہم نشیں شایانِ غالب چاہیئے

وہ کہ جس کے ہاتھ میں وراثت سے شمشیر تھی　　شاعری جس کے لئے اجداد کی تحقیر تھی
جس کے گھر میں کچھ خطوطِ یار کچھ تصویر تھی　　فکرِ رسوائی جسے مر کے بھی دامن گیر تھی
آج اس کی عظمتوں کا ذکر یوں محفل میں ہے
سُننے والا سوچتا ہے یہ بھی اس کے دل میں ہے

کاغذی تھا شوخیٔ تحریر کا جب پیرہن　　اس نے بخشا اپنے اندازِ بیاں کا بانکپن
دیکھ کر اس کے لب اعجاز کا طرزِ سخن　　شاعری بیتاب ہو کر بن گئی خود اس کا فن
اک بُتِ شیریں ہے پیکر اس کی ہر تحریر کا
یہ کرشمہ ہم نفس لانا ہے جوئے شیر کا

رند ہو کر کی ہے اس نے معرفت کی گفتگو　　رکھ لی اس نے آبروئے بادہ و جام و سبو
اس نے اس انداز سے توڑا طلسم ما و تو !　　رکھ دیا مٹی کا ساغر جام جم کے روبرو
ہم سے انکار کرامات جلی ہوتا نہیں
اور وہ کہتا ہے رندوں میں ولی ہوتا نہیں

لے گئے درمانِ غم ہستی ملی اس سے اجل　　وہ ہماری بزم میں ہے آج بھی جیسے تھا کل
اب کہاں مسرور اس کی نیند کا نعم البدل　　اس کے شانے پر ہے گیسوئے پریشانِ غزل
شدتیں غم کی بالآخر غم کا درماں ہو گئیں
مشکلیں اتنی پڑیں اس پر کہ آساں ہو گئیں

فیض احمد فیض

سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
اس خیاباں میں جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہوئی فرطِ طرب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گل کی شہ رگ پہ
کڑا وقت پڑا
سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
یہ بھرا شہر، جو اب وادیٔ ویراں بھی نہیں
اس کے کس کوچے میں، کس گھر میں، کہاں
وقت ڈھلے
آگ لگی تھی پہلے
ان گنت اس کے دریچوں کے پپوٹوں کے تلے
کس جگہ جوت جگی تھی پہلے
سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
ہم سے اُس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے محبوبۂ رفتہ کی طرح
سا کہنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے
اسی محبوبہ یا محبوب کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی
رات بتانے کے لئے
ہم اب اس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لئے
دل کی کیا پوچھتے ہو
سوچنے دو

احمد وصی

تیرا وجود

تم سمجھتے ہو، سلگتی ہوئی تنہائی
اس جگہ،
کوئی نہیں ہے جو دھڑکتے دل کی،
اور
تمہارے لبِ اظہار کی خاموشی کی گفتگو سن کے
جذبات کی باتیں سمجھے
تم کو یہ بھول ہے سانسوں کا امنڈتا طوفان
اور دھڑکتے ہوئے جذبوں کا مچلتا ہیجان
دیکھنے والا، یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں
کانپتے ہاتھوں کے ناپاک ارادوں کے قدم
اور ہوس ناک نگاہوں کی طرف دیکھ سکے
تم سمجھتے ہو کہ ایسے میں یہاں کوئی نہیں
یہ مگر بھول ہے
اک بھول ہے اور کچھ بھی نہیں
کیونکہ تم دونوں کے اس جُرم کا زولوش گواہ
میں بھی موجود ہوں
ایسے میں، یہاں میں بھی ہوں

قاضی سلیم

یاد

نرم ریشم کی طرح بنی خاموشی
جا بجا پھر مسکنے لگی
جسم کے آشیانوں سے طائر اُڑے
گرم تازہ لہو میں نہا کر پروں کو جھٹکنے لگے
دیر تک رنگ اڑتا رہا

نظم کہنے کے بعد

لو میں ایک اکائی ہوں
پتھر کے ٹکڑے کی طرح ایک اکائی
پتھر کی تحریریں دیکھو
کتنی دھاریں
لہریں
پیچ بھنور
جیسے طوفانی سمندر کی نبضیں چلتے چلتے تھم جائیں
جیسے سمندر مر جائے

وحیدہ اختر

پتھروں کا مغنّی

مطربِ خوش نوا زندگی کے حسیں گیت گاتا رہا
اس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی
اس نے جب زخمِ دل کو زباں بخش دی
سننے والوں نے بے ساختہ آہ کی
عشق کے ساز پر جب ہوا زخمہ زن
شورِ تحسیں میں خود اُس کی آواز دب سی گئی

مطربِ خوش نوا پھر بھی تنہا رہا

تشنگیِ مشام اس کو بادِ صبا کی طرح گل بہ گل لے گئی
کاسۂ چشم نے پرتوِ گُل بھی پایا نہیں
درد اُس کا کسی محرمِ درد کے واسطے
در بہ در شہر در شہر پھرتا رہا
داد و تحسیں کے ہنگامۂ ذوق کُش میں اُسے
ہر طرف سے ملامت کے پتھر ملے
مطربِ خوش نوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
پتھروں کو زباں تو ملی، پر تکلم نہیں
پتھروں کو ملے ہونٹ، لیکن تبسم نہیں
پتھروں کو ملی آنکھ، لیکن نظر کون دیتا اُنھیں
پتھروں کو ملے کان، پہ ذوقِ نغمہ نہیں

پتھروں کو خد و خالِ انساں ملے، دولتِ دردِ غم کب ملی
پتھروں کو حسیں صورتیں تو ملیں، دل نہیں مل سکا
پتھروں کو ملے پاؤں، پر اعتمادِ سفر کون دے
پتھروں کو ملے ہاتھ، پر عزمِ تیشہ زنی کون دے

سنگ سُنتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں
دیکھتے ہیں، مگر فرق کرتے نہیں
بات کرتے ہیں، محسوس کرتے نہیں
ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن پگھلتے نہیں
گرد بن کر یہ اُڑ جائیں، سانچوں میں ڈھلتے نہیں

مطربِ خوش نوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
مطربِ خوش نوا پتھروں کو سناتا رہا دردِ دل
اپنا غم
اُن کا غم
سب کا غم
پتھروں نے سُنا اور چپ چاپ ہنستے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنّی ہوں میں
اور بے درد، بے حس، ستم گار پتھر سنیں گے کبھی
اُن کا وہ مطربِ خوش نوا
شکوہ سنجِ زماں
اپنے نغمات کی آگ میں جل گیا
یا پھر اُن ہی کے مانند پتھر کا بت بن گیا

خلیل الرحمن اعظمی

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی

گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

زبیر رضوی

"نارسیٔ"

سیاہ رات
کھڑی ہے تمھاری چوکھٹ پر
ہر ایک در پہ پڑی چلمنوں نے چاہا ہے
خنک ہوا کا کوئی شوخ ۔ بدچلن جھونکا
تمھاری خوابگہِ ناز میں نہ دَر آئے
مری نگاہ اندھیرے میں ڈگمگاتی ہوئی
ہر ایک در پہ پڑی چلمنوں سے الجھی ہے
ملا نہ روزنِ امید تاکہ دیکھ سکے
تمھاری خوابگہِ ناز کے وہ سب منظر
جنھیں شباب کی دوشیزگی نے پالا ہے
لطافتوں سے بھری مستیوں میں ڈھالا ہے
کہ ہم ملے نہ کبھی
دن کی روشنی کے سوا !!

محمد علوی

سورج

وہ دیکھو سورج
زمین کے اندر
اُتر رہا ہے !
چلو، اُسے
دفن کر کے
اپنے گھروں کو جائیں
تمام دن کا عذاب
کھونٹی پہ ٹانگ کر
میلے بستروں کو
چمکتے خوابوں سے جگمگائیں
یہ وقت کیوں جاگ کر گنوائیں
کہ کل یہ سورج
اسی زمیں سے
نکل کے اپنے سروں پہ ہوگا
چلو اسے دفن کر کے
اپنے گھروں کو جائیں !!

پروین فناسیّد

آخرکار

تم کو پھر اصرار ــــ کہ میں
اک بار ــــ فقط اک بار
تمہارے ویرانے کو
اپنے گیتوں سے آباد کروں
تم کتنے عجیب دِوانے ہو
تم اب تک گیتوں اور غزلوں کی باتیں کرتے ہو
تم حسن کے قصّے چھیڑتے ہو
تم سچ کا علم لہراتے ہو
اک پل کے لئے سوچو تو ذرا
اس جگ میں آنکھیں موند کے سوچتے رہنا کتنا آسان ہے
اس جگ میں آنکھیں کھول کے چلنا کتنا مشکل ہے
اس جگ میں قدم قدم پہ ڈھیروں پتھر ہیں
اک پتھر کو تو ہٹا دو گے
لیکن کب تک ــــ لیکن کب تک ؟
آخر تمہیں ٹھوکر کھانا ہے
آخر تمہیں خود اپنے ہی لہو میں نہانا ہے
اس عالم میں تم گیت سنو گے ؟
حسن کی باتیں چھیڑو گے ؟
یاد دو گے ؟

سردار جعفری

پتھروں کا مغنّی۔ وحید اختر

حجلۂ شعر میں بیٹھی ہوئی فن کی دیوی نغمۂ انفس و آفاق سناتی ہے مجھے

مبارک ہے وہ شاعر جس نے یہ نغمہ سننے کی تمنا کی۔ شاعر کا منصب بہت بلند ہے۔ اس سے نیچی سطح پر شاعر اور شعر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اس زمانے میں بعض حلقوں سے یہ یقین دلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نئی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو بے بسی، مایوسی، تنہائی اور خوف و ہراس کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ شاعری اپنے اوپر کوئی سماجی ذمّہ داری عائد نہیں کرتی اور سیاست کو قابلِ نفرت چیز سمجھتی ہے۔ اس میں شوق، امنگ، ولولہ، حُسن، لطافت، شرافت ہر چیز کا فقدان ہے۔ داخلی ترنّم، خارجی آرائش اور حد یہ ہے کہ امیجری کی تراش و خراش بھی ناپید ہے۔ یہ شاعری جو کلاسیکی بھی نہیں اور رومانی بھی نہیں، صرف کلبیت اور چڑچڑے پن کا شکار ہے اور یہ چرائے ہوئے یا مانگے ہوئے بھوتوں سے پڑھنے والوں کو ڈراتی رہتی ہے۔ یہاں امید کو فرار کا نام دیا جاتا ہے اور ابلاغ کو عیب سمجھا جاتا ہے۔

نئی شاعری کی یہ تعریف بعض نئے شاعر اپنے نثر کے مضامین میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض لوگ اس کا اعتبار بھی کر لیتے ہیں اور اسی کسوٹی پر نئی شاعری

کو پرکھنے لگتے ہیں ۔ وہ اپنے بیان کی تصدیق میں بعض دوسرے تیسرے درجے کے شاعروں کا ٹوٹا پھوٹا کلام بھی پیش کر سکتے ہیں۔

اس غلط بیانی اور غلط فہمی کی مکمل تردید کے لئے وحید اختر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "پتھروں کا مغنی" کافی ہے ۔

وحید اختر صرف شاعر نہیں (صرف شاعر داغ اور نوح ناروی تھے) بلکہ دانشور بھی ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں عہد حاضر کا کرب بڑا باشعور رہا ہے ۔ انھیں معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ یہ کیا اور کیوں ہر سنجیدہ اور اہم شاعر کے لئے ضروری ہے اور اس کے لئے وہ تنہا جواب وہ ہے (ہومر، دانتے اور شیکسپیئر سے لے کر اقبال تک ہر عظیم شاعر باشعور اور ذمہ دار انسان رہا ہے۔ یہ جھوٹ اس زمانے میں مغرب کے انحطاطی سماج میں پھیلایا گیا ہے کہ شاعر بے شعور اور غیر ذمہ دار ہوتا ہے) بعض شاعروں کے یہاں یہ سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے اور بعض ان کا جواب دیتے ہوئے ہکلانے لگتے ہیں کیونکہ یہ سوالات شاعر کی منزل کا تعین کرتے ہیں اور ان کے جوابات منزلِ مقصود تک پہنچانے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

جب وحید اختر اپنے پیش لفظ میں یہ کہتے ہیں کہ "نیا ذہن بنا نہیں، بن رہا ہے اور اکثریت اب بھی انھیں کی ہے جو پرانے زمانے کے ماتم گسار اور سسکتی ہوئی سماجی، معاشی، اخلاقی اور روحانی قدروں کی لاشوں کے نگہدار ہیں۔ ۔ ۔ نئی اقدار جنم لے رہی ہیں۔ مگر ابھی ان میں وہ توانائی نہیں آئی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں" تو وہ اپنی شاعری کا نصب العین مقرر کر لیتے ہیں اور وہ ہے نئے ذہن کی تکمیل اور نئی قدروں کی توانائی۔

یہاں زندگی اور شاعری کو دو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ "میں شاعری اور زندگی کو ایک وحدت کے دو پہلو سمجھتا ہوں۔ میری شاعری کے موضوعات وہی ہیں جو زندگی کے مسائل ہیں۔" (دیباچہ)

وحید اختر نے نہ تو زندگی کے مسائل سے گریز کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ان مسائل کے سامنے اپنی شخصیت اور شاعری کو پسپا ہونے دیا ہے۔ گریز سستی رومانیت اور گھٹیا تفریح کی طرف لے جاتی ہے اور پسپائی کلبیت کی طرف۔ شاعر کا مقام ان دونوں مقامات سے بلند ہے۔

آج کا شاعر قدیم شاعر کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ حالات کا مقابلہ کر رہا ہے "سیّارد ثوابت پر کمندیں پھینکی جا رہی ہیں۔ فضا کے نارسا مقامات جہاں فرشتوں کے پر جلتے تھے اور تخیل کا بھی دم ٹوٹتا تھا اب ہماری رسائی میں ہیں۔ فاصلے گھٹ گئے ہیں، دوریاں سمٹ گئی ہیں پھر بھی ایک قیامت ہے جو ہماری آغوش میں رہ کر بھی ہم سے دور رہے۔ ہم سے دور ہو کر بھی ہمارے ساتھ ہے۔ غربت اور بے کاری، بھوک اور بیماری سے بھی جہاد جاری ہے اور ان کی نئی فصلیں بھی اٹھائی جا رہی ہیں۔ سائنس ہمارا مسیحا بھی ہے اور اس کے ہتھیار ہمارے قاتل بھی۔ عقل ہماری زندگی بھی ہے اور ہماری خودکشی بھی۔ علم ہماری آزادی بھی ہے اور ہماری غلامی بھی۔ آدرش ہمارے مسجود بھی ہیں اور مقتول بھی۔ ماضی ہم سے پیچھے بھی رہ گیا اور ہمارے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ حال ہماری دسترس میں بھی ہے اور ہم سے ہراساں بھی۔ زمان و مکان کی تمام حدیں ایک دوسرے میں الجھ کر گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارا ہے اور ہمارا کچھ بھی نہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جسے میں نے اپنے اندر اور باہر دیکھا، پایا، محسوس کیا اور برتا ہے۔ اسی نے میری زندگی کی بھی تشکیل کی ہے اور شاعری کی بھی۔ اسی لئے میں نے اپنی زندگی اور شاعری کو بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں پایا۔ زندگی اور شاعری کی اس وحدت کو پانے کے لئے مجھے بہت کچھ کھونا اور ترک کرنا پڑا ہے۔" (دیباچہ)

اس بیان میں زندگی اور سماج کی جدلیاتی حقیقت کا پورا شعور ہے اور

اس شعور سے وحید اختر نے اپنی شاعری کا خمیر اُٹھایا ہے۔ جب شعور شعر بن جاتا ہے تو خوابوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

خواب پرستی، ادب اور شاعری، فلسفے اور فنون لطیفہ کا سرچشمہ رہی ہے۔ آج بھی ہے مستقبل کی دنیائیں ماضی کے خوابوں میں ڈھل کر نکھرتی اور سنورتی ہیں۔ یہی خواب جمالیاتی مسرت بھی بہم پہنچاتے ہیں اور عارفانہ بصیرت بھی۔ فن اور ادب کی جمالیاتی اقدار خواب، حقیقت اور انسان کے رشتوں پر ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جو خواب دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں یا انھیں حقیقت میں تلاش نہیں کر سکتے سستی تفریحوں سے لذت حاصل کر لیتے ہیں ہمارے معاشرے میں اقدار کے بحران اور اجتماعی طور پر تہذیب کی اعلیٰ قدروں کا واضح تصور نہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تر جمالیاتی مسرت کے حصول کا جذبہ کمیاب ہوتا جا رہا ہے۔" (دیباچہ)

یہ ہے وہ مقام جہاں شاعر کی ذات معاشرے سے ٹکراتی ہے اور اس قید خانے سے نکلنے کے لئے ذات کا سفر شروع کرتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی عہد ایسا نہیں گزرا جس میں شاعر کو خوف، تنہائی، موت، بے حسی، جبر، انتشار اور اس قسم کی دوسری کیفیات سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اگر شاعر کو ذات کا عرفان ہے جس کے لئے ایک فطری نقطۂ نگاہ کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ان کیفیات کو اس طرح اپنے شعر میں ڈھالتا ہے کہ اس کی ذات فاتح اور کامران نظر آتی ہے۔ اور اگر عرفان ذات نہیں ہے اور وہ فکری خلا میں سفر کر رہا ہے تو یہ کیفیات اس کا اور اس کے فن کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ آج کے بعض شاعر جن کے کلام پر کلبیت کی مردنی چھائی ہوئی ہے، رومی اور اقبال کے عرفانِ ذات (فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر) سے کتنے دور ہیں۔ ان کے برعکس وحید اختر کی شاعری اس عرفانِ ذات سے کتنی قریب ہے۔ اول الذکر اپنی تقدیر کے زندانی ہیں اور ثانی الذکر زنداں شکن اور

تقدیر گر۔ اگر شاعر معاشرے کے شکنجے کو توڑ رہا ہے تو وہ سماجی اور سیاسی موضوعات سے گریز نہیں کر سکتا۔ وحید اختر اس کی خوب صورت مثال ہیں[۱]۔ "یہ اظہار ذات بھی زندگی اور کائنات سے انسان کے مثبت اور صحت مند رشتے کے عرفان اور اس کی تلاش ہی کا وسیلہ ہے۔" (دیباچہ) ہمیں خواب اور حقیقت کو ایک دوسرے سے قریب تر لانا ہے۔ یہ آج کی شاعری کا مقدر بھی ہے اور منصب بھی۔ اسی لئے میں نے کبھی سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھنے کو ادبی گناہ نہیں سمجھا۔ خالص ترین فن کا مرعوب کن سے مرعوب کن نظریہ بھی شاعر کو اپنے عہد اور اس کے مسائل سے بے تعلق رہنے کا گر نہیں سکھا سکتا۔ یہ تاریخ کا جبر نہیں فن کار کی آزادی کا سوال ہے۔" (دیباچہ)

یہ ہے وحید اختر کا نظریہ جو ترقی پسند تحریک کے نظریۂ ادب سے متاثر ہے۔ یہ ادب کا سماجی نظریہ ہے۔ لیکن اس کا استعمال شاعر نے صرف سماج کی انسان دشمن اور تہذیب سوز طاقتوں کے خلاف نہیں کیا ہے بلکہ ترقی پسند تحریک کے ایک خاص دور کی انتہا پسندی اور ادعائیت کے خلاف بھی۔ اس آویزش میں انھوں نے اپنے نظریے کو ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے نظریے کو اپنی ذات اور فن کی حفاظت کے لئے سپر اور تلوار بنا لیا۔ فن اور تکنیک کے اعتبار سے بھی ان کی شاعری ترقی پسند شاعری کی بہترین روایات کی توسیع ہے لیکن وحید اختر کی انفرادیت کی مُہر کے ساتھ۔ مثالیں ۔

مضمحل چہروں پہ امید کی ہلکی سی کرن
اپنی محنت سے سمیٹے ہوئے حاصل کی خوشی
حجلۂ شوق میں بیٹھی ہوئی فن کی دیوی
شاعروں اور ادیبوں کی کھنکتی محفل
چند معصوم سی خوشیوں کی یہ دنیائے حسیں

عہدِ انساں پہ یقیں کرنا سکھاتی ہے مجھے
لذّتِ شوق کے اسرار بتاتی ہے مجھے
نغمۂ انفس و آفاق سناتی ہے مجھے
دعوتِ فکر و نظر دے کے بلاتی ہے مجھے
غم و آلام میں جینا بھی سکھاتی ہے مجھے

(زادِ راہ)

نقرۂ و نغمہ ہی میں ملتا ہے جہاں ذوقِ نظر
قیمتِ حُسنِ نظر اور بڑھا دیتا ہوں

آبِ شمشیر نہیں چارہ گرِ زخمِ بہار
مرا فن دادطلب ہے غمِ انساں تجھ سے
اس لطافت پہ کہ دھڑکن دلِ نازک پہ ہے بار
آشنا پھر بھی ہوں اے شورشِ طوفاں تجھ سے
عمر بھر ساتھ نبھانے کا ہے پیماں تجھ سے

ثمرِ محنتِ آدم سے نکھرتا گلزار
بن کے عنواں مری نظموں کو صدا دیتا ہے

گونجتے شہر رواں اور دواں راہ گزار
کارخانوں کے دھڑکتے ہوئے سینوں کا دھواں
مکتبِ اہلِ ہنر، مدرسۂ فکر و نظر
زندگانی سے چھلکتے ہوئے میدان و مکاں
عرقِ جہد سے مہکی ہوئی کشتِ دہقاں

دستِ محنت سے نکھلتی ہوئی روشن دھاتیں
پائے رہرو سے سمٹتی ہوئی منزل کا نشاں
جاگتے دوڑتے دن نیند میں لپٹی راتیں
روز لاتی ہیں سخنور کے لئے سوغاتیں

آتشِ عشق کی حدت میں تپائے ہوئے دل
اپنی گرمی مرے افکار کو دے دیتے ہیں
یادِ محبوب میں آنکھوں سے بہائے ہوئے دل
اپنا اخلاص مرے پیار کو دے دیتے ہیں
اپنی دھڑکن مرے اشعار کو دے دیتے ہیں

(دعائے نغمہ)

فریب کھائے ہیں اتنے بہ نامِ فصلِ بہار
اب اعتبارِ مسیحائی صبا بھی نہیں

عبارت آج ہے زخموں کے مسکرانے سے
شگفتِ گُل کبھی تشبیہ تھی ہنسی کے لئے

چمن سیاستِ گل چیں سے ہے خزاں آثار
نسیمِ صبح پہ در بند ہے سموم آزاد

علوم و نغمہ و تہذیب حُسن کے خالق
طلا و سیم کے بازار میں ہیں جنسِ حقیر
پیمبرانِ زمانہ، مزاج دانِ حیات
بتانِ جہل و توہم کی زلف میں ہیں اسیر
جبینِ عظمتِ انساں کے راز داں کعبے
صنم کدوں میں بھٹکتے ہیں بندگی کے لئے

اُٹھا رہا ہے نیا جام ساقیٔ دوراں
جو ہو گا فتح کی تقریب آخری کے لئے

(عہدِ آشوب)

تم اپنے سورجوں کی روشنی اپنے ہی گھر رکھو
تم اپنی سب بہاریں دامنوں سے باندھ کر رکھو
ہم اپنے ڈوبتے سورج اُٹھا لیتے ہیں مژگاں پہ
جنہوں کو آزما لیتے ہیں اپنے ہی گریباں پہ
یہی تقسیمِ فطرت ہے یہی رمزِ مشیّت ہے
تم اپنے جام و خم لے لو، ہم اپنی تشنگی لے لیں
جو لے لو شہر و گلشن تم تو ہم آوارگی لے لیں

(صد حساب باقی)

کون کہہ سکتا ہے کہ ان نظموں میں جوشؔ اور فیضؔ، مجازؔ اور جذبیؔ کی بہترین روایات کی شمعیں نہیں جل رہی ہیں۔ اس مسئلے پر کم غور کیا گیا ہے کہ ہر عہد کا ایک مجموعی آہنگ ہوتا ہے اور اس کے اندر شاعر اپنی انفرادی لے بناتا ہے۔ لیکن آہنگ معنی سے بے نیاز نہیں ہے۔ قدیم ہندوستان کے نظریے کے مطابق ارتھ (معنی) دھونی (دُھن = آواز) میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک عہد کا مشترک ذخیرۂ الفاظ اور بعض مشترک مضامین بھی ہوتے ہیں۔

ہمارے عہد میں ہندوستان کا قدیم جاگیرداری نظام جو صدیوں سے ٹوٹ رہا تھا آخر اس منزل میں پہنچ گیا ہے جہاں وہ نئے سرمایہ داری نظام اور آخر میں اشتراکیت کے لئے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ تاریخی عمل ناگزیر بھی ہے، خوشگوار بھی اور تکلیف دہ بھی۔ نئی قدروں کے بننے اور پرانی قدروں کے ٹوٹنے میں بیک وقت نزع کا کرب اور نئی ولادت کا جشن مل جاتا ہے۔ اس تبدیلی کا عکس پوری دردمندی کے ساتھ اس شعری مجموعے میں نظر آتا ہے۔ یہ موضوع قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور قاضی عبدالستار کی تحریروں میں بھی مشترک ہے لیکن سب کی فنی سطحیں الگ الگ ہیں۔

وحید اختر کے یہاں کلاسیکی شاعری کا رچاؤ ہے اور جدید شاعری کا آہنگ، تشبیہہ، استعارے اور محاکات کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ نئی اور پرانی امیجری شیر و شکر ہو گئی ہے۔ کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر بیجا طور سے امیجری کا رعب ڈال رہا ہے۔ وہ شعر کے جسم پر ایک خوش نما لباس کی طرح ہے۔ وحید اختر کی شاعری پر ایک اور اثر شیعہ ماحول اور مرثیہ کا ہے۔ کربلا کے بعض واقعات کو مثلاً (شامِ غریباں) وحید اختر نے نیا مفہوم ادا کرنے کے لئے بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔

وحید اختر کی ایک بہت اچھی نظم جسے اس مجموعہ کا شاہکار کہنا چاہیے "صحرائے سکوت" ہے۔ یہ بھرپور نظم ہے اور اپنی طوالت کے باوجود خوش گوار ہے۔ اس میں کئی مقامات ایسے ہیں جو عظیم شاعری کے حدود میں قدم رکھتے ہیں۔ دوسری نظموں میں طوالت گراں گزرتی ہے۔ کہیں کہیں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض نظموں کی زبان بہت زیادہ فارسی آمیز اور ادق ہے۔ حالانکہ وحید اختر کو آسان اور شگفتہ زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ جس کی مثال "بن باس" میں موجود ہے۔ اس مجموعے میں جدید مغربی سانچے نہیں استعمال کئے گئے ہیں۔ چند آزاد نظمیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کہیں کہیں زباں کا

استعمال کھٹکتا ہے۔ وہ زبان پر قدرت کی کمی نہیں بلکہ ذرا سی بے توجہی کا نتیجہ ہے۔ مثلاً یہ مصرع۔

جل گئے شہپر جبریل کہیں سدرہ پہ

یا

نیند میں جو سپنے دیکھے ہیں، عمر تمام نہ سونے دیں گے

ایک جگہ مشین کا لفظ اعلانِ نون کے بغیر استعمال ہوا ہے۔

ایک اور بات، وحید اختر کی جو نئی شاعری اس زمانے میں شائع ہو رہی ہے وہ کچھ اور سمتوں میں جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بعض ایسی قدریں جھلک رہی ہیں جو ان کے نظریۂ شعر اور شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان پر رائے زنی کرنا تو شاید قبل از وقت ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ بڑا شاعر زمانے کی رَو میں نہیں بہتا ہے۔

اقبالؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے مغربی علوم اور ادب سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی اپنی شاعری کو کلاسیکی انداز میں محدود رکھا۔ ٹیگور نے بھی یہی کیا۔ "ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر۔"

مجھے اس پوری کتاب میں صرف پچیس لفظوں پر شدید اعتراض ہے۔ وہ بھی نظم کے نہیں نثر کے پچیس لفظ۔ "علی گڑھ نے زندگی کے لمبے سفر سے تھک جانے کے بعد مجھے آسائشِ منزل مہیا کی۔ زندگی سے اب میرا جھگڑا حریفانہ نہیں دوستانہ ہو گیا۔"

دراصل قابلِ اعتراض تو لفظ ہیں۔ آسائشِ منزل تو شاعر پر حرام ہے۔ ہاں معاشی تحفظ برحق ہے۔ لیکن اگر یہ سچ ہے کہ "کوئی داد کو نہیں پہنچتا۔ نہ دادِ محشر ہے نہ میزانِ عدل، مگر میدانِ حشر ضرور آباد ہے۔" اور اگر "تعصب، توہم، تنگ نظری اور تنگ دلی شک اور خوف کے اندھیرے اب تک گہرے ہیں" اور "بڑے بڑے لوگ سمجھوتے بازی

اور سودے بازی کرتے ہیں تو ایک باشعور اور حساس شاعر کا جھگڑا زندگی سے دوستانہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو شاعر یہ کہتا ہو ؎

ہمارے عہد میں یوں روزِ جشن آتا ہے
کہ جیسے شمر ہو آ کر شریک بزمِ عزا

وہ اپنے عہد کے شمر اور یزید، خولی اور حرملا سے دوستانہ جھگڑا کیسے کر سکتا ہے۔ اُسے تو ساحلِ فرات پر بھوکا پیاسا شہید ہونا پڑے گا۔

رابرٹ فراسٹ کے لئے یہ کہنا ٹھیک ہے کہ "میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے"۔ اس میں پریمیوں کا لفظ بہت بلیغ ہے کیونکہ یہاں دوستانہ اور حریفانہ دونوں انداز ہوتے ہیں ؎

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے (غالبؔ)

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ رابرٹ فراسٹ نے اپنی شاعری کے لئے وہ آدرش مقرر نہیں کئے تھے جو وحید اختر نے مقرر کئے ہیں۔ وہ فطرت کے سادہ اور پُر کار حُسن کا شاعر ہے اور وحید اختر "تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں" میں کھڑے ہیں جہاں "تشنگی، آبلہ پا، شعلہ بہ کف موجِ سراب" (جعفری) کی کیفیت ہے۔

جیسے ایک تندرست اور توانا بیج میں پھل اور پھول دیکھے جا سکتے ہیں اسی طرح "پتھروں کا مغنّی" کے اوراق پر اس عہد کے ایک اہم شاعر کے اُبھرتے ہوئے نقوش دکھائی دے رہے ہیں اور میں اس نئے شاعر کو محبت سے سلام کرتا ہوں ؎

"دانہ را کہ بہ آغوشِ زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ برومند جواں می بینم"

Collection of Shobhit Mahajan. Courtesy Sarai.

فراقؔ گورکھپوری

یہ جو قول و قرار ہے کیا ہے
شک ہے یا اعتبار ہے کیا ہے

جس کو کہتے ہیں ہم بہارِ چمن
برگ ہے گل ہے خار ہے، کیا ہے

کچھ جو اُٹھتا ہے دل میں رہ رہ کر
ابر ہے یا غبار ہے، کیا ہے

نیچی نظروں میں کچھ تبسّم سا
شوخ ہے، شرمسار ہے، کیا ہے

کوئی دل کا مقام سمجھائے
گھر ہے یا رہ گزار ہے، کیا ہے

پھول ہے یا چراغ ہے کوئی
یہ جو روئے نگار ہے، کیا ہے

بادۂ زندگی سے عالم کو
نشہ ہے یا خمار ہے، کیا ہے

تر و سوزاں ہیں جس سے یہ پلکیں
اشک ہے یا شرار ہے، کیا ہے

جس سے سینہ ہے خار خار اپنا
اک گلِ نوبہار ہے، کیا ہے

شبِ فرقت میں ہر ستارے کی لَو
اک چراغِ مزار ہے، کیا ہے

نہ کھُلا یہ کہ سامنا تیرا
دیر ہے، انتظار ہے، کیا ہے

نہ کھُلا اس کے طور سے نہ کھُلا
دشمنِ جاں ہے، یار ہے، کیا ہے

یاد بھی تو تری نہیں آئی
دل جو یوں بے قرار ہے، کیا ہے

مجھ کو سب اختیار ہے لیکن
یہ جو سب اختیار ہے، کیا ہے

آدمی اس دیارِ ہستی میں
اک غریب الدیار ہے، کیا ہے

زندگی اک نشاطِ ازلی ہے
یا غمِ تازہ کار ہے، کیا ہے

کاش سمجھیں اسے اگرچہ فراقؔ
یہی اک بادہ خوار ہے کیا ہے

نذیر بنارسی

تم نہیں آتے تو اس جینے سے باز آتا ہوں میں
مجھ کو ٹھکراتے ہو تم دنیا کو ٹھکراتا ہوں میں

دن ڈھلا جاتا ہے، شام آتی ہے گھبراتا ہوں میں
ڈوبتا جاتا ہے سورج، ڈوبتا جاتا ہوں میں

اک ٹھکانہ تھا جہاں بہلا لیا کرتا تھا دِل
آج اس محفل کو بھی زیر و زبر پاتا ہوں میں

تم اگر آؤ سحر میری نہ آؤ شام ہے
اب تمہیں کو مالکِ شام و سحر پاتا ہوں میں

میری گذری زندگی آواز دیتی ہے مجھے
اے مغنی بند کر نغمہ کہ گھبراتا ہوں میں

آگئی ہے یاد آج اپنے دلِ مرحوم کی
ساری دنیا سوگ میں ڈوبی ہوئی پاتا ہوں میں

تم وہی، محفل وہی، محفل کی رعنائی وہی
ان دلوں کچھ اپنے ہی کو دوسرا پاتا ہوں میں

یہ سفیدی ہے سحر کی یا تمنا کا کفن
ہائے کیا پانا تھا کیا وقتِ سحر پاتا ہوں میں

آپ کیوں فرمائیں سمجھانے کی زحمت محترم
دل مجھے سمجھا رہا ہے دل کو سمجھاتا ہوں میں

سب کو دیتا ہوں حرارت اک مجھے دل سے نذیر
اپنی سرد آہوں سے ہر محفل کو گرماتا ہوں میں

نور محمد نور

میکشو! کارِ مغاں اس قدر آساں تو نہیں
یہ بتاؤ تمہیں اندیشۂ حرماں تو نہیں

نہ جنوں خیز ہوا ہے نہ طرب خیز نوا
اور موسم ہے کوئی فصلِ بہاراں تو نہیں

یوں جو بوجھل سی دمِ صبح صبا آتی ہے
اپنے دامن میں چھپائے کوئی طوفاں تو نہیں

عزم کے سامنے کیا آہن و فولاد کا زور
محکم اس درجہ رفیقو درِ زنداں تو نہیں

ان دنوں نظمِ گلستاں میں ہے کس درجہ دخیل
باغباں سے کوئی صیاد کا پیماں تو نہیں

کس کا کوچہ ہے؟ یہاں کتنا سکوں ملتا ہے
دیکھنا یہ کوئی غارت گرِ ایماں تو نہیں

زیست اشکوں کی نہیں خوں کی طلبگار ہے نور
چمن اس طرح بنے گا یہ بیاباں تو نہیں

شہزاد احمد

آئے تو اس سے آنکھ ملا کر کبھی دیکھئے
جو سوچتے ہیں آپ ذرا کہہ کبھی دیکھئے

وہ آگ ہے کہ برف، ہیولا کہ آدمی
اب کے ملے تو ہاتھ لگا کر کبھی دیکھئے

شاید بہت قریب سے اتنا حسیں نہ ہو
اک روز اس کو پاس بٹھا کر کبھی دیکھئے

آنکھوں پہ اعتبار زیادہ نہ کیجئے
شیشہ ہے یا کہ سنگ اٹھا کر کبھی دیکھئے

لکھا ہوا ہے گھر کے دریچے پہ میرا نام
میں کون ہوں، کبھی مجھے آ کر کبھی دیکھئے

تارِ نفس ہے یا کہ ہے مہتاب کی کرن
اک رات یہ چراغ بجھا کر کبھی دیکھئے

لکھی ہے جس کے واسطے شہزاد یہ غزل
دو ایک شعر اس کو سنا کر کبھی دیکھئے

فضیل جعفری

صاحب دلوں سے راہ میں آنکھیں ملا کے دیکھ
رکھتا ہے تو بھی دل تو اسے آزما کے دیکھ

پہچاننے کی پیار کو کوشش کبھی تو کر
خود کو کبھی تو اپنے بدن سے ہٹا کے دیکھ

یا لذّتوں کو زہر سمجھ اور دور رہ!
یا شعلۂ گناہ میں دامن جلا کے دیکھ

ہر چند ریگ زار سہی زندگی مگر
پل بھر کو اپنے جسم کا جادو جگا کے دیکھ

سائے کی طرح ساتھ چلے گی کوئی صدا
سنسان جنگلوں میں اکیلے بھی جا کے دیکھ

ناصرؔ زیدی

مثالِ سادہ ورق تھا، مگر کتاب میں تھا
وہ دن بھی تھے، میں ترے عشق کے نصاب میں تھا

بھلا چکا ہے تو اک بار مجھ سے آکر سن!
وہی سبق جو کبھی تیرے دل کے باب میں تھا

جو آج مجھ سے بچھڑ کر بڑے سکون میں ہے
کبھی وہ شخص مرے واسطے عذاب میں تھا

اسی نے مجھ کو غم و سوز جاوداں بخشا
وہ ایک چاند کا ٹکڑا سا جو نقاب میں تھا

مرا وجود مجسّم خلوص تھا ___ ناصرؔ
میں پھر بھی بارگہِ حسن کے عتاب میں تھا

اقبال متین

اُمڈے بادل کی طرح آنکھوں سے برسے یارو
پھر بھی ہم پیار کی اک بوند کو ترسے یارو

ہم اُٹھائے بھی گئے، ہم کو نکالا بھی گیا
کوڑے کرکٹ کی طرح اپنے ہی گھر سے یارو

ڈوب جانا ہی محبت کا مقدر ہوگا
اب تو ہر موجِ بلا گزرے ہے سر سے یارو

ہم لُٹے بھی تو سرِ راہِ وفا ایسے لٹے
کوئی آواز نہ آئی کسی در سے یارو

اف رے پندار کہ جس وقت بھی سر اپنا جھکا
لوٹ آئی ہے دُعا بابِ اثر سے یارو

ڈوبتی رات ہے، رستے کا دیا ہے، میں ہوں
کوئی گزرا تھا سرِ شام ادھر سے یارو

مرتضیٰ برلاس

اپنا تو بس کام یہی ہے سب کے غم اپناتے رہنا
ناخن زخمی کرتے رہنا، ہر گتھی سلجھاتے رہنا
جانا ہے تو شوق سے جاؤ دور نگر آباد کرو
وقت ملے تو گاہے گاہے خوابوں کو مہکاتے رہنا
آج یہ جن دیواروں کو تم اونچا کرتے جاتے ہو
کل کو ان دیواروں سے پھر اپنا سر ٹکراتے رہنا
ہم ہیں وہ آواز جو گھٹ کر ساری فضا میں گونجیں گے
بعد ہمارے آوازوں کو زنجیریں پہناتے رہنا
لوگ تو تم کو بادل سمجھیں، پانی کی امید کریں
اور تمہارا کام ہمیشہ پتھر ہی برساتے رہنا
ہم تو ہیں بس شام کا دیپک اول شب بجھ جائینگے
تم ہی یارو آخر شب تک دیپ سے دیپ جلاتے رہنا

حامد حسین حامد

جسم کی آگ میں جلتے رہیے
موم کی طرح پگھلتے رہیے
آہ و فریاد میں ڈھلتے رہیے
خاک و خوں چہرے پہ ملتے رہیے
منزل و رہ کا تعین کیسا!
چل پڑے آپ تو چلتے رہیے
اپنی تشہیر کی خاطر ہی سہی
گھر سے باہر بھی نکلتے رہیے
روح کی موت سے بچنے کیلئے
اپنے قالب کو بدلتے رہیے

عتیق احمد عتیق

زعمِ تدبیر میں تقدیر سے ہارا کہ نہیں
تجھ کو آخر ترے پندار نے مارا کہ نہیں

میرے آئینۂ اجمال میں تفصیل کے ساتھ
کر لیا آپ نے اپنا بھی نظارا کہ نہیں

میں نے اُس زلفِ پریشاں سے مشابہ پاکر
گیسوئے شاہدِ گیسو کو سنوارا کہ نہیں

ظلمتِ شب کا جگر چیر کے ہم نے آخر
وقت کے ڈوبتے سورج کو اُبھارا کہ نہیں

ہم نے اُس دَور کے بگڑے ہوئے ماحول کے ساتھ
زندگی کو بھی کبھی رُخ سے سنوارا کہ نہیں

شوقِ ساحل میں جو ٹکرا گئے طوفانوں سے
اُن کو ہر موجِ حوادث نے اُبھارا کہ نہیں

موت کے نام سے جو لوگ لرزتے تھے عتیق
زندگی بن کے اُنھیں موت نے مارا کہ نہیں

اختر انصاری

کُل دیا ہے مری نظروں نے کہاں عطرِ شباب
عرق آلود ہوئے ہیں ترے عارض کے گلاب

رات بھیگی ہے گنہگار کے دامن کی طرح
پھول برسا گئے شاید تری زلفوں کے سحاب

لالہ و گُل کے لئے موجِ صبا نے اکثر
تیری آنکھوں کے شگوفوں سے نچوڑی ہے شراب

میرا نغمہ ہے کہ جذبات کی پگھلی ہوئی آگ
تیرا اندازِ تکلم ہے کہ موجِ مئے ناب

دل تو شبنم کے نگینے کی طرح نازک ہے
زندگی ریت کی دیوار ہے یا نقشِ بر آب

ہے بجا شکوۂ بے مہریٔ احباب مگر
کون دیتا ہے محبت کا محبت سے جواب

سامنے کون ہے یوں محوِ تجمل کہ اختر
میری آنکھوں میں اُتر آیا ہے جیسے مہتاب

حباب ہاشمی

تیری صورت ترا جلوہ بھی نہیں ساتھ اپنے
زندگی کا کوئی خاکہ بھی نہیں ساتھ اپنے

اور کیا اس سے سوا ہوگی سیہ بختیِ دل !
شبِ تاریک میں سایہ بھی نہیں ساتھ اپنے

سرفروشی کی تمنّا تو بڑی بات ہے دوست
کسی منصور کا قصہ بھی نہیں ساتھ اپنے

آج آیا ہے مجھے تیری وفاؤں کا پیام
دل میں جب کوئی تمنا بھی نہیں ساتھ اپنے

حُسن کس طرح سے مائل بہ کرم ہو ہمدم !
عشق کا کوئی سلیقہ بھی نہیں ساتھ اپنے

زندگی کیا ہے زمانے کو بتاؤ حباب
زندگی کا کوئی لمحہ بھی نہیں ساتھ اپنے

محمود عشقی

لائیں ہم گوہرِ نایاب کہاں سے یارو
عمر بھر ڈرتے رہے آبِ رواں سے یارو
ابر کی گود سے یوں برق کا لہرا نکلا
تیر جس طرح نکلتا ہے کماں سے یارو
دل پہ رہ رہ کے لگاتے ہو کچوکے پیہم
کام تلوار کا لیتے ہو زباں سے یارو
کام کی چیز وراثت میں کوئی مل نہ سکی
ہم نے ہر مال خریدا ہے دکاں سے یارو
چوٹ کھائے ہوئے ہر دل پہ رکھا ہے مرہم
ہم نے کانٹے بھی نکالے ہیں یہاں سے یارو
لبِ شیریں پہ تبسم ہے مگر زہر بھرا
پھول اس طرح سے ہنستے ہیں کہاں سے یارو

توصیف تبسم

دلِ دیوانہ غمِ عشق میں رسوا جو ہوا
دیکھنے وہ بھی چلے آئے تماشا جو ہوا

اتنے تنہا تو نہ تھے روشنیوں میں دن کی
سارا غم دل میں سمٹ آیا اندھیرا جو ہوا

کیسے شفاف غمِ جاں سے بھرے تھے ساغر
پی لیا زہر تری آنکھ کا دھوکا جو ہوا

خاک اُڑتی ہے دل و جاں میں رہیں کیونکر
آنکھ دریا نہ ہوئی غم کبھی صحرا جو ہوا

آؤ اب ہم ہی ہر اک شیشے پہ ماریں پتھر
ہم ہی دیوانے ہوئے ہم کو ہی سودا جو ہوا

ہائے کیا چیز ہے مٹی کی محبت توصیف
لوگ روئے تھے بہت شہر اکیلا جو ہوا

انتخاب سید

غم کے ساگر میں اُترتا شہر دیکھ
ہنسنے والے آ ہمارا شہر دیکھ

راکھ ہو جائے گا تھوڑی دیر میں
آگ کے شعلوں میں ہنستا شہر دیکھ

خوف کی پرچھائیاں تک جل گئیں
مدتوں پہلے کا دیکھا شہر دیکھ

اک تری خاطر چلا جاتا ہوں میں
رو رہا ہے آج سارا شہر دیکھ

آسمانوں سے بھی اونچا ہو گیا
مے کدے والوں سے روٹھا شہر دیکھ

زندگی شیشے کے محلوں میں نہیں
کش مکش کا زہر پیتا شہر دیکھ

ذہن کی آنکھوں سے دیکھا جائے گا
درد کا ناسور بنتا شہر دیکھ

دل کے دروازوں پہ تالے پڑ گئے
خوف کے صحرا میں ڈوبا شہر دیکھ

روس کے عظیم ادیب

میکسم گورکی

کی یاد میں

جس کی صد سالہ سالگرہ ۲۸ مارچ ۱۹۶۸ء

کو پوری دنیا میں منائی گئی

کانستنتن فیدن (ایک سویت ادیب)

ایک ادیب ایک فنکار

جب میں سپاہی بھرتی ہو کر ۱۹۱۹ء کے موسم خزاں میں پیٹرس برگ آیا تو میں نے اس شہر کو ایک قلعہ پایا۔ دراصل اسے "پیترو گراد کا مستحکم حلقہ" کہا جاتا تھا، جس کا صدر مقام شہر کے عین وسط میں تھا۔ پیتر اور پال کا قلعہ۔ یوڈنک کے شاہ پرست فوجی شہر کے قریب آچکے تھے اور ان کے کمانڈر پلکوو کی بلندیوں سے دوربینوں میں سے ماسکو وسکایا زاستاوا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ہلہ بول کر یا گھیرا ڈال کر شہر پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

اس وقت پیٹرس برگ کے مزدوروں اور سرخ فوج نے ایک ایسی کوشش کی جو بہت سے لوگوں کو ناقابل یقین معلوم ہو سکتی تھی۔ انھوں نے دشمن کو روک دیا، پچھاڑ دیا اور اسے پیچھے دھکیل دیا۔ یوڈنک کی فوج کا ذلت انگیز حد تک صفایا ہو گیا۔

شہر کے ہر بازار، ہر مکان اور ہر پتھر پر دیر تک اس پر شجاعت کوشش کے نشان ثبت رہے۔ شہر میں امن کے زمانہ میں جتنے لوگ رہتے تھے اب ان کے ایک تہائی حصہ کے برابر لوگ وہاں رہتے تھے۔ لوگ بھوک، ٹائفس، سردی، بیماری اور چھوٹی چھوٹی ہزاروں ایسی دشواریوں کے مصائب جھیل رہے تھے امن کے زمانہ میں جن کے وجود کا ان کو شک تک نہیں ہوتا تھا۔

رات کو پیٹرس برگ سیاہ اور بے کنار غاروں کا پیچ در پیچ مجموعہ نظر آتا تھا۔ صبح چار بجے اداراتی دفتر سے نکلتے ہوئے مجھے "پانچ گوشوں" اور ریکی کے نکڑ کے درمیان ایک بھی شخص نہیں ملتا تھا۔ بعض اوقات پاسوں کی پڑتال کرنے کے لئے تاریکی اور خاموشی میں سے کوئی گشتی دستہ نمودار ہوتا تھا اور پھر تاریکی اور سکوت میں غائب ہو جاتا تھا۔

بہر کیف اس فاقہ کش اور سردی سے منجمد قلعہ کو اس کے نئے اور خیال افروز مستقبل پر غیر فانی اعتماد کے باعث برقرار رکھا گیا۔

مجھے یا میرے چاروں طرف موجودہ لوگوں کو مسلسل مصروف رکھنے والے کام نے موت سے دور رہ کر زندگی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد سے نہ روکا۔ اس وقت بھی میں ایک گھنٹے کے لئے ادب کو فراموش نہ کر سکا۔ میں وسیع و عریض شہر یعنی کل کی راجدھانی میں تنہا تھا۔ جسے کبھی یہ تک نہ ہوا تھا کہ ادیب بننے کا خواب دیکھنے والا، فتوحات کی امید رکھنے والا اور شاید شہرت کی آرزو رکھنے والا ایک اور نوجوان اس کی سڑکوں پر نمودار ہو چکا تھا۔

میرے دل میں ہر بات کو سمجھنے کی زبردست خواہش تھی اور مجھے یقین تھا کہ صرف ادب ہی بہترین انداز میں اس خواہش کو پورا کر سکتا ہے۔ میں نے جنگی قیدی کی حیثیت سے جو تجربہ کیا تھا اس کے بعد میں جس قومی احساس کے ساتھ انقلاب میں شامل ہوا تھا وہ ملک کا روس کا احساس تھا۔ انقلاب نے بھی اس احساس کو منافر نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اس کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ بالشویک وطن پرست تھے۔ تمام دیگر پارٹیاں بالشویکوں کی مخالف تھیں۔ کیونکہ وہ پارٹیاں رسوائی کی حد تک وطن کو خیر باد کہہ چکی تھیں۔ ان رسوا پارٹیوں نے غیر ملکی ریاستوں اور حکومتوں سے ساز باز کی جنہوں نے ہمارے ملک کے خلاف حملہ کیا۔ اور انقلاب نے نفرت اور حقارت سے اس کا حساب چکایا۔

بہت سے لوگ میری ہی طرح سوچتے تھے اور مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگ ادب سے عظیم الفاظ کی توقع رکھتے تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ روسی ادیب واقعات میں روائتی بے لوث شرکت کی بدولت لوگوں کی مدد کرتے تاکہ وہ ان واقعات کو زیادہ صحت کے ساتھ دیکھیں اور ان کی قدر کریں۔

مسلم الثبوت ادیب کے لئے یہی ایک جستجو تھی۔ اگرچہ اس وقت ان لوگوں کے فنا اور معدوم ہو جانے کے بعد لفظ "مسلم الثبوت" سے بڑی کاوش کے ساتھ گریز کیا جاتا تھا جو بڑے اور چھوٹے انتہائی ناقابل تردید مسلم الثبوت استاد دکھائی دیتے تھے۔

ادب بڑی حد تک محصور پیٹرس برگ سے ملتا جلتا تھا۔

وہ لوگ جو اپنے فرار یا اپنی روانگی سے دشمن کے ساتھ جا ملے تھے وہ حقیقت کے نزدیک معدوم ہو چکے تھے۔ جو لوگ اپنی مرضی کے خلاف یا قوت ارادی کی کمی کے باعث قلعہ میں رہ گئے تھے وہ صرف اس لئے زندہ تھے کہ اُن کو زندہ رہنا تھا۔ ادب میں وہ زندہ نہیں تھے۔ غاروں کے ان تنہا گوشوں میں کوئی بھی آنکھ جھانک کر نہیں دیکھ سکتی تھی جہاں ایسے ادیبوں نے گھن گرج اور دھماکوں سے پناہ لے رکھی تھی۔ دیگر ادیب سخت بے چین تھے، الگ تھلگ رہتے تھے خاموش تماشائیوں کی طرح۔

شجاعت، بھوک، بیماریوں اور خاموشی کے اس پیٹرس برگ میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو الگ کھڑا تھا مگر حقیقتاً اس تحریک کا مرکز تھا، جس نے فروغ پانا شروع کیا تھا۔ وہ شخص گورکی تھا۔ اس کی تحریک دانشوروں کے سوویت کام کا آغاز تھی۔

گورکی نے اپنی سحر آفریں بانسری پر لوگوں کو جمع کرنے کا راگ چھیڑا۔ اور آہستہ آہستہ لوگوں کی ہمت بڑھی اور اُنھوں نے اپنے بلوں اور غاروں سے باہر جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم پیشہ لوگوں کی جاں بلب انجمن کے فروغ میں قرون وسطیٰ کا رنگ تھا۔ ادیب نمودار ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی منجمد روشنائی کو گرم کیا۔ سائنس داں نمودار ہوئے۔ اور وہ اپنی اپنی فرنیچر اور کٹھالی میں اپنے اپنے مقام پر جا بیٹھے۔ گورکی اثر و رسوخ کے ان گنت ذرائع رکھتا تھا اور سب سے بڑا ذریعہ اس کی شخصیت تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی بھی ذہین آدمی گورکی کے مقاصد کی پاکیزگی پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دانشوروں میں اعلیٰ اصول نایاب تھے۔ گورکی کو تمام دانشوروں پر اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ ان کی زندگی انقلاب کی تاریخ سے بنی گئی تھی اور انقلاب کی ملکیت تھی۔ وہ اپنے عہد

کی سوانح عمری تھا۔ لہٰذا اس کا موضوعوں کے اس طرف یعنی انقلاب کے ساتھ ہونا قدرتی تھا۔ اور اس کی اپیلوں میں قیاس آرائی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ اس کی سابقہ شہرت۔ آرٹ میں اس کا اثر و رسوخ۔ لہٰذا ان کی بدولت وہ لوگوں کے دل و دماغ پر اتنا چھایا ہوا تھا کہ اسے اپنی شہرت میں مزید اضافہ کے لئے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک ادیب کی حیثیت سے گورکی نے کسی کو یہ ترغیب نہ دی کہ وہ نقالی کرے۔ اور مجھے کوئی ایسی بات یاد نہیں آتی کہ اس نے اپنے آرٹ کو مثالی آرٹ بنا کر پیش کیا ہو۔

وہ اپنے آرٹ کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ اگرچہ وہ واضح طور پر اپنے آرٹ کے اثر کے نشانات چار سو بکھرے ہوئے دیکھتا تھا مگر اس نے کبھی اپنا مدرسۂ فکر قائم کرنے کی بات نہیں سوچی تھی۔ اس کا آرٹ اس سوانح عمری کا حصہ تھا، جو اس کی اپنی شخصیت تھی اور اس کی شخصیت کی مثال اس زمانے کی ایک انتہائی طاقتور شبیہ کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی تھی اور ہر نیا ادیب اپنا رُخ گورکی کی طرف موڑتا تھا تاکہ اسے اچھی طرح دیکھ سکے اور اس سے کچھ سیکھ سکے۔

ادب پر گورکی کے اعتقاد اور ادب کے لئے اس کے احترام نے اُسے نوجوان سوویت ادیبوں کی نسل کے حوصلے دوچند کرنے والا ادیب بنا دیا تھا۔ اس نسل نے گورکی سے ادب پر اعتقاد اور ادب کے لئے احترام سیکھا۔ نوجوان نسل کا مقدر بنانے کے لئے گورکی جیسے ادیب کی ایک اور خوبی کچھ کم اہم نہ تھی اور وہ خوبی تھی۔ کام کی جانب اس کا رویہ۔ اس نے اپنے ناقابل تقلید لب و لہجے میں "ادیب" کا لفظ اپنی زبان سے ادا کیا اور اس لفظ میں ادب کے لئے دیرینہ احترام کی گونج تھی گورکی اپنے آپ کو ادیب اور فنکار کہتا تھا کیونکہ عمر بھر اس نے اپنے کام کے لئے پیشہ ورانہ احساس کو کھویا نہیں تھا جو محنت کش اور فنکار کی خصوصیت ہوتا ہے۔ اور شاید اسی لئے بھی کہ بچپن ہی سے اُسے یہ بات یاد تھی کہ لوگ ہمیشہ اپنی زبان سے "فنکار" کا لفظ یوں ادا کرتے تھے کہ اُس میں تحسین اور تفاخر کا رنگ ہوتا تھا۔ وہ اپنی ادبی انجمن پر نازاں تھا اور انجمن کے کارکن کی طرح

اسے اپنا کام عزیز تھا اور وہ کام کے لئے اپنی اس محبت کا مظاہرہ اپنی ذاتی مثال سے کیا کرتا تھا۔ اس کے لئے کوئی بھی کام دشوار اور سخت نہیں تھا۔ وہ حوصلہ افزائی اور تعریف کی طاقت سے آشنا تھا اس لئے وہ انتھک طور پر بڑی مسرّت کے ساتھ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ "آپ نے کتنی شاندار بات کہی ہے !" وہ کون سا ایسا ذہین ادیب ہے جس نے دھیمے اور نرم لہجے میں کہے ہوئے یہ روح افزا الفاظ نہ سُنے ہوں۔

وہ ایک ادیب کی حیثیت سے نوجوانوں کو نہ صرف اپنی عقل و دانش اور جدوجہد اور کام میں اپنا تجربہ عطا کرتا تھا بلکہ آرٹ کے میدان میں خود ایک نامور استاد ہوتے ہوئے اپنی آواز کے پوشیدہ خزانے نمایاں کیا کرتا تھا۔ اس قسم کے امتزاج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی اعتبار سے یہ گورکی کے مقدر میں تھا کہ وہ نئے ادب میں پہلا نامور ادیب بنے اور وہ بن کر رہا۔

محمود احمد ہنر ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرس میں چھپوا کر دفتر رسالہ شاہکار، ۱۴ بخشی بازار الہ آباد سے شائع کیا۔

میکسم گورکی

غدار کی ماں

ماؤں کے متعلق آدمی تمام عمر باتیں کر سکتا ہے۔ کئی ہفتے سے غنیم کی فوجوں نے شہر کو ایک آہنی حلقے میں لے کر اس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ رات کے وقت الاؤ روشن ہو جاتے تھے اور ان کے شعلے لاتعداد سرخ آنکھوں کی مانند، گھپ اندھیرے کے اندر سے شہر کی دیواروں کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ بدباطنی سے بھڑکتے رہتے تھے اور ان کی دھمکیوں سے غضب آلود نگاہیں محصور شہر والوں کے دلوں میں افسردہ کن خیالات پیدا کر دیتی تھیں۔

وہ دیواروں کے اوپر سے دشمن کے پھندے کو اپنی گردنوں کے گرد کستا ہوا دیکھتے تھے۔ وہ الاؤ کے نزدیک تاریک سایوں کو منڈلاتا دیکھتے تھے، خوب کھائے پیئے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنتے تھے، ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے تھے اور فتح کا یقین رکھنے والے لوگوں کے قہقہوں اور گیتوں کی آواز سنتے تھے اور دشمن کی ہنسی اور گانے بجانے سے زیادہ اور کون سی چیز کانوں کو گراں گذر سکتی ہے؟

دشمن نے شہر کے لئے پانی مہیا کرنے والے سب ندی نالوں کو لاشوں سے پٹ کر رکھا تھا۔ اُنھوں نے شہر پناہ کے ارد گرد لگی ہوئی ساری انگور کی بیلوں کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، کھیتوں کو روند ڈالا تھا،

اور پھلوں کے باغوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب شہر چاروں طرف کھلا ہوا تھا اور تقریباً ہر روز دشمن کی توپیں اور دستی بندوقیں اس پر سیسے اور لوہے کی بوچھار کرتی تھیں۔

جنگ سے تھکے ہوئے، نیم فاقہ کش سپاہی شہر کی تنگ سڑکوں پر بیزاری اور اداسی سے گشت کرتے رہتے تھے۔ مکانوں کی کھڑکیوں کے اندر سے زخمیوں کی کراہیں، سراسیمہ زدہ لوگوں کی چیخیں، عورتوں کی دعائیں، اور بچوں کی رُوں رُوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔ لوگ سرگوشیوں میں بات کرتے تھے، جملے کے بیچ میں یکایک رُک جاتے تھے اور ایک قسم کے تناؤ کے ساتھ کان کھڑے کر لیتے تھے۔ "کہیں یہ دشمن تو آگے نہیں بڑھ رہا ہے؟"

اور راتیں سب سے بدتر تھیں۔ سکوتِ شب میں کراہیں اور چیخیں زیادہ صاف طور پر سنائی دیتی تھیں۔ دور کے پہاڑوں کی گھاٹیوں میں سے سیاہ سائے دبے پاؤں نکل کر نیم مسمار دیواروں کی طرف بڑھتے تھے اور غنیم کے پڑاؤ کو چھپا دیتے تھے، اور پہاڑوں کے کالے کناروں کے اوپر چاند ایک کھوئی ہوئی ڈھال کی طرح نمودار ہوتا تھا، جس پر تلوار کے واروں نے نشان ڈال رکھے تھے۔

اور شہر کے لوگ جنھیں نصرت اور مدد پانے سے ناامیدی ہو چکی تھی، جنھیں بھوک اور محنت نے خستہ کر دیا تھا، جن کی نجات کی امید روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی وہ شہر کے لوگ چاند کو، پہاڑوں کے تیز دانتوں والے کناروں کو، گھاٹیوں کے کالے پٹیوں کو اور غنیم کے پڑاؤ کو ہیبت زدہ سے ہو کر دیکھتے تھے۔ ہر چیز ان کو موت کا پیغام سناتی تھی اور آسمان پر ایک بھی ستارہ نہیں تھا جو ان کی کچھ ڈھارس ہی بندھا دیتا۔

وہ گھروں میں روشنی کرنے سے ڈرتے تھے اور سڑکیں ایک دبیز پردۂ تاریکی میں ملفوف رہتی تھیں۔ اور اس اندھیرے میں ایک عورت سر سے پاؤں تک ایک سیاہ لبادے میں ملبوس اس طرح بے آواز قدموں سے پھرا کرتی تھی جس طرح مچھلی دریا کی گہرائیوں میں حرکت کرتی ہے۔

جب لوگ اسے دیکھتے تھے تو ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے تھے۔

"یہ وہی ہے؟"

"ہاں وہی ہے"

اور وہ محرابوں کے نیچے کسی کونے کھدرے میں ہولیتے تھے یا سر جھکائے ہوئے تیزی سے اس کے پاس سے گذر جاتے تھے ۔ طلایہ کے سردار سختی سے اُسے خبردار کرتے تھے ۔

"مونا ماری آنا پھر باہر نکلی پھر رہی ہو؟ احتیاط سے کام لو ورنہ تم قتل کر دی جاؤگی ، اور کوئی شخص قاتل کا سُراغ لگانے کی تکلیف گوارا نہیں کرے گا ......"

وہ سیدھی تن کر کھڑی ہو جاتی تھی اور انتظار کرنے لگتی تھی لیکن طلایہ والے اس کے پاس سے گذر جاتے تھے ، وہ یا تو اس پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت نہیں کرتے تھے اور یا پھر اس بات کو اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے ۔ مسلح لوگ اس طرح اس سے بچتے تھے جیسے کسی لاش سے بچا جاتا ہے ۔ اور اس طرح وہ اندھیرے میں تن تنہا رہ جاتی تھی اور سیاہ اور بے آواز ، شہر کی مصیبت کے زندہ مجسمے کی مانند ، سڑکوں پر اپنا تنہا گشت شروع کر دیتی تھی اور اس کے اردگرد ہر طرف ، گویا اس کا تعاقب کرتی ہوئی ، سوگوار آوازیں ، کراہیں ، چیخیں ، دعائیں اور فتح کی تمام امیدیں کھوئے ہوئے سپاہیوں کی آزردہ اور بیزار گفتگو کی آوازیں ---- فریاد سی کرتی رہتی تھیں ۔

وہ جو ایک شہری بھی تھی اور ماں بھی ، اپنے بیٹے اور وطن کے متعلق سوچتی رہتی تھی ، کیوں کہ اس کا بیٹا ، اس کا خوش باش ، خوبصورت ، سنگدل بیٹا ، ان لوگوں کا سردار تھا جو اس کے شہر کو تباہ و برباد کر رہے تھے ۔ لیکن ابھی کچھ بہت عرصہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو فخریہ نگاہوں سے دیکھتی تھی اور اسے اپنے ملک کے لئے اپنی طرف سے ایک بیش بہا تحفہ سمجھتی تھی ۔ وہ اسے ایک ایسی سُود مند قوت سمجھتی تھی ، جسے اس نے اس لئے جنم دیا ہو کہ وہ اس کے شہر کے لوگوں کی مدد کرے جو اس کی اپنی جنم بھومی تھا اور اس کے بیٹے کی جنم بھومی بھی تھا ۔ اس کا دل سیکڑوں غیر مرئی بندھنوں کے ذریعے ان قدیم پتھروں سے ، جن سے اس کے پرکھوں نے اپنے گھر تعمیر کئے تھے اور جن سے اُنھوں نے شہر پناہ بنائی تھی اور اس مٹی سے ، جہاں اس کے پیاروں اور رشتہ داروں کی ہڈیاں دفن تھیں ، اور لوگوں کی امیدوں سے اور گیتوں سے اور داستانوں سے بندھا ہوا تھا ۔ اور اب اس دل نے اپنے ایک پیارے

کو کھو دیتا تھا اور وہ روتا تھا۔ وہ ترازو کی طرح اپنے دل میں اپنے بیٹے کی محبت اور اپنی جنم بھومی کی محبت کو تولتی تھی مگر نہیں بتا سکتی تھی کہ ان میں سے کس پلّہ بھاری ہے۔

جو اس طرح رات کے وقت سڑکوں پر ماری ماری پھرتی تھی اور بہت سے لوگ جو اسے نہیں پہچانتے تھے خوف سے پیچھے ہٹ جاتے تھے کیونکہ وہ اس کے سیاہ پیکر کو اس موت کا مجسّمہ سمجھتے تھے جو ان سب کے اس قدر نزدیک تھی، اور جب وہ اسے پہچان لیتے تھے تو خاموشی سے ایک غدّار کی ماں سے دور ہٹ جاتے تھے۔

لیکن ایک دن شہر پناہ کے ایک دور دراز گوشے میں اس نے ایک اور عورت کو دیکھا جو ایک لاش کے قریب گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ وہ اس قدر بے حس و حرکت تھی کہ دھرتی کا ایک حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ عورت دُعا مانگ رہی تھی اور اس کا غم زدہ چہرہ ستاروں کی جانب اُٹھا ہوا تھا۔ اور اوپر دیوار پر سنتری دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے اور ان کے ہتھیار پتھروں سے ٹکرا رہے تھے۔

غدار کی ماں نے پوچھا۔

"تمھارا شوہر؟"

"نہیں۔"

"تمھارا بھائی؟"

"میرا بیٹا ————— میرا شوہر تیرہ دن ہوئے مارا گیا ——— اور میرا بیٹا آج۔"

اور مقتول کی ماں نے اُٹھتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

"کنواری مریم سب کچھ دیکھتی اور سب کچھ جانتی ہیں اور میں ان کی شکر گزار ہوں!"

"کس لئے؟" پہلی عورت نے پوچھا اور دوسری نے جواب دیا ———

"اب جبکہ وہ اپنے دیش کی خاطر لڑتا ہوا عزّت کی موت مر چکا ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اس کے لئے کچھ ڈر لگتا تھا۔

وہ بے فکرا سا لڑکا تھا، رنگ رلیوں کا ضرورت سے زیادہ رسیا، اور مجھے ڈر تھا کہ وہ شاید اپنے دیش کے ساتھ غداری کر دے۔ جس طرح ماری آنا کے بیٹے نے کی۔ وہ خدا اور انسان دونوں کا دشمن، ہمارے دشمنوں کا سردار ــــ خدا کا غضب پڑے اس پر اور اس کوکھ پر جس نے اُسے جنم دیا!"

ماری آنا نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور آگے بڑھ گئی۔ اگلی صبح کو وہ شہر کے محافظین کے سامنے گئی اور ان سے کہا۔

"میرا بیٹا تمھارا دشمن بن گیا ہے۔ یا تو مجھے مار ڈالو اور یا پھر شہر کے پھاٹک کھول دو تاکہ میں اس کے پاس جا سکوں۔"

اُنھوں نے جواب دیا۔

"تم انسان ہو اور تمھیں بھی یقیناً اپنا وطن عزیز ہوگا، تمہارا بیٹا اسی طرح تمہارا بھی دشمن ہے جس طرح ہم سب کا ہے۔"

"میں اس کی ماں ہوں مجھے اس سے محبت ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج وہ جو کچھ بن گیا ہے اس کے لئے میں قصوروار ہوں۔"

تب اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور فیصلہ کر لیا۔

"تمہارے بیٹے کے گناہ کیلئے تمہیں قتل کرنا شریفانہ بات نہیں ہوگی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم اسے یہ خوفناک گناہ کرنے کی ترغیب نہیں دے سکتی تھیں اور ہم تمہاری تکلیف اور پریشانی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن شہر کو تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ ایک ضمانتی قیدی کی حیثیت سے بھی نہیں۔ تمہارے بیٹے کو تمہاری ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ تمہیں بالکل بھول چکا ہے۔ خبیث تو وہ ہے ہی۔ اور اگر تم سمجھتی ہو کہ تم کسی سزا کی مستحق ہو تو یہی تمہاری سزا ہے۔"

"ہاں" اس نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زیادہ خوفناک سزا ہے۔"

سو اُنھوں نے پھاٹک کھول دیئے اور اسے شہر کے باہر کر دیا اور بہت دیر تک وہ دیواروں

مجھے اوپر سے اسے اپنی جنم بھومی سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتے رہے ۔ اس جنم بھومی سے، جسے اب اس کے بیٹے کے بہلائے ہوئے خون نے تر بتر کر رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی کیونکہ اس کے قدم اس دھرتی سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور وہ شہر کے ناصروں اور محافظوں کی لاشوں کے سامنے تعظیماً جھکی اور ایک ٹوٹے ہوئے ہتھیار کو کراہیت کے ساتھ پاؤں سے ایک طرف ہٹا دیا کیونکہ ماؤں کے لئے سارے ہتھیار نفرت انگیز ہیں۔ سوائے ان ہتھیاروں کے جو زندگی کی حفاظت کرتے ہیں ۔

وہ ایسے چل رہی تھی گویا اپنے لبادے کے نیچے پانی کی ایک بیش قیمت شیشی لئے جا رہی ہو اور ڈرتی ہو کہ کہیں اس کا کوئی ایک قطرہ گر نہ پڑے اور جب شہر پناہ سے دیکھنے والوں کو اس کا پیکر زیادہ سے زیادہ چھوٹا معلوم ہونے لگا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی مایوسی، ناامیدی اور لاچاری بھی رخصت ہو گئی ۔

اُنھوں نے اسے آدھے راستے پر ٹھہر کر اپنے لبادے کے چڈ کو پیچھے کی طرف جھٹک کر مڑ کے دیر تک شہر کو تکتے ہوئے دیکھا ۔ اور غنیم کے لشکر والوں نے اسے میدان میں یکہ و تنہا کھڑے ہوئے دیکھا اور خود اسی کے پیکر جیسے تاریک پیکر محتاط طریقے سے اُس کی طرف بڑھنے لگے ۔ وہ اس کی طرف آئے اور دریافت کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے ۔

"تمہارا سردار میرا بیٹا ہے ۔" اس نے کہا اور ان میں سے کسی کو بھی اس میں کوئی شُبہ نہیں تھا۔ وہ اس کے قریب آ کر اس کے بیٹے کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے اور بتانے لگے کہ وہ کس قدر عقلمند اور بہادر ہے ۔ اور وہ فخر سے سر اونچا کئے اظہار حیرت کئے بغیر ان کی باتیں سُنتی رہی کیوں کہ اس کا بیٹا اس کے علاوہ اور کسی طرح کا ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔

اور اب آخر کار، وہ اس کے سامنے کھڑی تھی جسے وہ اس کی پیدائش سے ۹ مہینے پہلے سے جانتی تھی، اس کے سامنے جسے اس نے کبھی اپنے دل سے دُور محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ ریشم اور مخمل میں ملبوس وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، اس کے ہتھیاروں میں بیش قیمت ہیرے جواہرات جڑے تھے سب کچھ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنی چشم تخیّل میں اسے بارہا اسی طرح دیکھا تھا۔

دولت مند، مشہور اور ممدوح خلائق ۔

"ماں!" اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "تم میرے پاس آگئیں، تم میرے ساتھ ہو، بس اب کل میں اس جہنمی شہر پر قبضہ کر لوں گا۔"

"اس شہر پر جہاں تم پیدا ہوئے۔" اس نے اپنے بیٹے کو یاد دلایا۔

وہ جو نشۂ قوت میں مخمور اور زیادہ شہرت اور شان کی پیاس سے دیوانہ و بے خود تھا، اس نے ماں کو شباب کی پُرغرور گرمی کے ساتھ جواب دیا۔

"میں دنیا میں آیا اور پوری دنیا کی خاطر آیا اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں دنیا کو اپنے سامنے تحیّر و تعجب سے لرزہ براندام کر دوں گا۔ میں نے تمہاری خاطر ابھی تک اس شہر کو چھوڑ رکھا ہے، یہ میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے اور میری شہرت کی راہ میں روڑا بنا رہا ہے۔ لیکن کل میں ضدی احمقوں کے اس نشیمن کو کچل ڈالوں گا۔"

"جہاں کے ہر ہر پتھر کو تیرا بچپن یاد ہے۔" اس نے کہا۔

"پتھر گونگے ہوتے ہیں تاوقتیکہ انسان ان کو زبان عطا کرے۔ پہاڑ میرا تذکرہ کریں۔ یہ ہے میری خواہش تو!"

"اور انسان؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں میں انسانوں کو نہیں بھولا ہوں، ماں! ۔ مجھے ان کی بھی ضرورت ہے۔ کیوں کہ صرف انسان کے حافظے میں رہ کر ہی ہیرو لافانی بنتے ہیں۔"

اس نے کہا۔

"ہیرو وہ ہے جو موت کا مقابلہ کر کے زندگی کی تخلیق کرتا ہے، جو موت پر فتح پاتا ہے۔"

"نہیں" وہ معترض ہوا۔ "غارت گر بھی اسی قدر عظمت و شان کا حامل ہے جس قدر کسی شہر کو بنانے والا۔ دیکھو، ہم یہ نہیں جانتے کہ روم کو کس نے بنایا تھا۔ اینیاس نے یا رومولس نے ۔ لیکن ہم الارک کا اور ان دوسرے ہیروؤں کا نام اچھی طرح جانتے ہیں جنھوں نے اُسے تباہ و برباد کیا۔"

"اور شہران سب ناموں کے بعد تک زندہ رہا۔" ماں نے اُسے یاد دلایا۔

اور وہ دونوں اسی طرح گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ سورج آرام کرنے کے لئے غروب ہوگیا۔ وہ بعد میں اس کی مجنونانہ باتوں کے دوران میں اُسے کم سے کم ٹوکنے لگی اور اس کا پرِ فخر سر زیادہ سے زیادہ نیچے جھکتا چلا گیا۔

ماں تخلیق کرتی ہے، حفاظت کرتی ہے اور اس سے تخریب کی باتیں کرنا گویا اس کے خلاف باتیں کرنا ہیں۔ لیکن اس نوجوان کو یہ نہیں معلوم تھا اور وہ ماں کے وجود کے مقصد و معنی کی نفی کر رہا تھا۔

ماں ہمیشہ موت کی مخالف ہوتی ہے۔ وہ ہاتھ جو انسانوں کے گھروں میں موت لے کر آتا ہے، ماؤں کے لئے بہت نفرت انگیز ہوتا ہے۔ لیکن بیٹے نے یہ نہیں دیکھا کیوں کہ اسے تو شان و شوکت کی، دلوں کو مردہ اور بے حس کر دینے والی چمک دمک نے خیرہ کر رکھا تھا۔

اور نہ ہی وہ جانتا تھا کہ جس وقت اس زندگی کا سوال ہو جس کی ماں نے تخلیق کی ہے اور جسے وہ عزیز رکھتی ہے اس وقت ماں جسقدر نڈر ہوتی ہے اسی قدر ہوشیار اور بے رحم بھی ہو سکتی ہے۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اور سردار کے پر تکلف طریقے سے آراستہ خیمے کے دروازے میں سے اسے وہ شہر نظر آیا جہاں اس نے پہلی دفعہ اپنے اندر زندگی کی میٹھی تڑپ اور حرکت محسوس کی تھی اور جہاں اُسے اس بچّے کی پیدائش کے کربناک دردوں کا تجربہ ہوا تھا جو اب تخریب کا پیاسا ہو رہا تھا۔

سورج کی قرمزی کرنوں نے شہر کی دیواروں اور میناروں کو اس طرح خون کے سے سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا اور کھڑکیوں کے شیشوں پر ایک ایسی مخاصمانہ چمک ڈال رکھی تھی کہ پورا شہر ایک زخموں سے چور تودہ معلوم ہوتا تھا جس کے ہر ہر گھاؤ سے زندگی کا سرخ عرق بہہ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد شہر ایک لاش کی مانند تیرہ و تار ہوگیا اور اس کے اوپر ستارے ماتمی شمعوں کی طرح ٹمٹمانے لگے۔

ماں نے ان اندھیرے گھروں کو دیکھا جہاں لوگ شمعیں جلاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ اس طرح دشمن کی توجہ کا مرکز نہ بن جائیں۔ اس نے لاشوں کی بدبو سے سڑتی ہوئی اور ظلمت کے پردے میں

پٹتی ہوئی سڑکوں کو دیکھا، اس نے موت کے منتظر لوگوں کی دبی دبی سرگوشیاں سُنیں۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھا۔ پر وہ چیز جو اُسے عزیز تھی، جو اس کے دل سے قریب تھی، اس کے سامنے کھڑی بے زبانی سے اس کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ اور وہ اپنے کو شہر کے تمام لوگوں کی ماں محسوس کرنے لگی۔

بادل پہاڑ کی تاریک چوٹیوں سے اُتر کر وادی میں آ گئے اور پردار گھوڑوں کی سی برق رفتاری کے ساتھ اس شہر پر چھا گئے جس کی قسمت میں موت اور تباہی لکھی تھی۔

"ہم آج رات حملہ کر سکتے ہیں۔" اس کے بیٹے نے کہا۔ "بشرطیکہ رات کافی تاریک ہو! جب سورج کی روشنی آنکھوں میں پڑتی ہے اور ہتھیاروں کی چمک نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے اس وقت لوگوں کو قتل کرنا مشکل ہے۔ تب بہت سے وار خالی جاتے ہیں۔" اس نے اپنی تلوار کا معائنہ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

ماں نے اس سے کہا۔

"آؤ میرے بیٹے میرے سینے پر سر رکھ کر گھڑی دو گھڑی آرام کر لو۔ تمہیں یاد ہے کہ تم بچپن میں کس قدر زندہ دل اور نیک طبیعت تھے اور سب لوگ تم سے کس قدر محبت کرتے تھے۔"

بیٹے نے ماں کے حکم کی تعمیل کی، وہ اپنا سر اس کی آغوش میں رکھ کر لیٹ گیا۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہنے لگا۔

"میں صرف شہرت و شان سے محبت کرتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں کہ تم نے مجھے ایسا بنایا۔"

"اور عورتیں؟" ماں نے اس کے اوپر جھک کر پوچھا۔

"ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور آدمی ان سے اسی طرح اُکتا جاتا ہے جس طرح اور ہر ضرورت سے زیادہ میٹھی چیز سے اُکتا جاتا ہے۔"

"اور کیا تمہیں اولاد کی خواہش نہیں ہے؟" اس نے آخری دفعہ اس سے پوچھا۔

"اولاد کس لئے؟ مارے جانے کے لئے؟ غالباً میرا ساکوئی اور شخص میری اولاد کو قتل کر دے گا اور اس سے مجھے دُکھ ہوگا۔ لیکن میں اس وقت تک بوڑھا ہو چکا ہونگا اور ان کا انتقام

نہیں لے سکوں گا۔"

"تم ہو تو خوبصورت لیکن بجلی کی طرح بے ثمر ہو۔" اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"ہاں بجلی کی طرح ..... " اس نے سکراجواب دیا۔

اور وہ اپنی ماں کی چھاتی پر سر رکھے رکھے بچے کی طرح اُونگھ گیا۔

تب اپنے سیاہ لبادے سے ڈھک کر اس نے اپنے بیٹے کے دل میں ایک چاقو گھونپ دیا۔ اور بیٹے نے ایک جھرجھری سی لی اور اسی لمحے ختم ہوگیا۔ کیونکہ ماں سے بہتر اور کون جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کا دل ٹھیک کس جگہ دھڑکتا تھا۔ اور اس کی لاش کو حیرت زدہ سنتریوں کے قدموں پر ڈالتے ہوئے اس نے شہر والوں سے اس طرح خطاب کیا۔

"ایک انسان کی اور شہری کی حیثیت سے میں اپنے دیش کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے کر دیا۔ ایک ماں کی حیثیت سے میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گی! اب میں بوڑھی ہوئی، ایک اور بیٹے کو جنم نہیں دے سکتی۔ اور میری زندگی کسی کے لیے ضروری نہیں ہے۔"

اور اس نے مضبوطی سے وہی چاقو جو اس کے بیٹے کے، خود اس کے، خون سے ابھی تک گرم تھا اپنے سینے میں بھونک لیا۔ اور ایک دفعہ پھر اس کا وار بالکل ٹھیک دل پر پڑا کیوں کہ ایک دردبھرے، اور کرب آشنا دل پر ٹھیک وار کرنا مشکل نہیں ہے۔

سعد شمیم

میں شکاری ہوں

میں اپنے حلقے میں بڑا نامور شکاری مانا جاتا ہوں۔ میرے محلّے میں شاید ہی کوئی ہو جو میرے کارناموں سے واقف نہیں ہے۔ سوائے چند لوگوں کے جو پیدائشی حاسد ہیں اور خواہ مخواہ مجھ سے جلتے ہیں۔ خدا کے فضل سے سبھی میرے معتقد ہیں ____ لیکن میں انھیں خاطر میں نہیں لاتا۔ آخر وہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ تھوڑا علم خطرناک ہوتا ہے۔ ان کی بھی یہی حالت ہے۔ عجیب اُلٹے دماغ کے آدمی ہیں۔ ان سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ بغیر منطق اور ثبوت کے کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔ خیر چھوڑیئے! میں بھی کس کی باتیں لے بیٹھا۔

بات یہ ہوئی کہ پچھلے سال میں تقریباً دو برس کے بعد وطن واپس آیا۔ کہاں سے آیا۔ یہ بتانا بے کار ہے۔ صرف اتنا جان لیجئے کہ میں کہیں بہت دور سات سمندر پار نہیں گیا تھا۔ وہاں سے واپس آتے وقت اتفاقاً ایک عدد پرانی بندوق بھی میرے ساتھ تھی جو میرے ایک دوست نے مجھے رکھنے کو دی تھی۔ میں اُسے نہ لاتا لیکن وہ میرے ایک دوست کی امانت تھی جسے میں کسی صورت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی میرا دوست مہینوں سے لاپتہ تھا اور قانوناً اس کا وارث میں ہی ہوتا تھا۔ بندوق کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ٹیکسلا کی کھُدائی میں دستیاب ہوئی ہے۔ یہاں پہنچنے پر کسی نے پوچھا۔

"کہاں رہے اتنے دنوں تک ؟"

بندوق کو اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے جواب دیا۔ "افریقہ میں۔"

"اچھا — ؟ کیا کرتے تھے وہاں ؟"

"شکار کھیلتا تھا۔"

"یعنی صرف شکار کھیلنے افریقہ گئے تھے ؟"

"تو اور کیا — یہاں شیر کہاں ملے گا ؟"

"شیر کا شکار — ؟"

"آپ نے کیا سمجھا خرگوش کا — ؟"

"جنگل میں گئے تھے — ؟"

"اب کوئی ایک آدھ جگہ گیا ہوتا تو نام لیتا — تقریباً سارا افریقہ چھان مارا۔ ان دو سالوں میں۔"

"لیکن پھر بھی — ایک آدھ جگہ کے بارے میں تو کچھ بتایئے۔"

"اب مثال کے طور پر اسی ناکالوٹو کے جنگل کو لیجئے۔ وہاں میں چار مہینے رہا اور شاید اٹھارہ شیروں کا شکار کیا۔"

اس نے مرعوب ہو کر کہا۔ "لیکن آپ نے بڑی غلطی کی یہاں آکر — وہیں رہ جاتے یہاں کیا کریں گے ؟"

جواب دیا۔ "ارہر کی دال کا بیوپار کریں گے۔"

"وہ کیوں — ؟"

میں نے مسکرا کر بزرگانہ انداز میں اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا جانیں — شیر کے شکار اور ارہر کی دال کے بیوپار میں کتنا قریبی رشتہ ہے۔"

آخر اسے میرا قائل ہونا ہی پڑا۔ اور جب میں نے اسے اپنے شکار کی بیسیوں

داستانیں سُنا ڈالیں تو وہ مُرید بن گیا۔

آئیے آج میں آپ کو بتاؤں کہ میں پلک جھپکتے میں اتنا بڑا شکاری کیسے بن گیا۔ اس کا مختصر سا جواب ہے، "داستان گوئی"۔ بغیر کسی جھجک کے میں اپنے شکار کی ایسی طلسم ہوش رُبا قسم کی داستانیں سُنا ڈالتا ہوں کہ لوگ دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ جاتے ہیں۔ داستانوں کی جتنی قسمیں ہیں، ان میں سب سے آسان شکار کی داستان ہے شکار کی تقریباً تمام داستانیں ایک جیسی ہوتی ہیں جس میں شکاری آخر کار شکار کر لیتا ہے اور داستان ختم ہو جاتی ہے ـــــ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ بھی تھوڑی سی مشق کے بعد فرضی داستانیں سُنا سُنا کر میری طرح نام پیدا نہ کر لیں۔

میں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے شیر کا شکار بھی اتنا ہی آسان ہے جتنا بکری کا۔ اس لئے شیر کو چھوڑ کر بکری کی طرف کون جائے ـــــ ویسے بھی شیر سے کمتر درجے کا شکار اپنی شان کے خلاف ہے۔

اپنی داستان کا آغاز میں ہمیشہ کچھ اس طرح کرتا ہوں۔

"میں نے پندرہ سال افریقہ کے جنگلوں میں یورپ کے مشہور شکاریوں کے ساتھ گذارے ہیں۔ اس کے بعد دس سال تک ہندوستان اور پاکستان کے مختلف جنگلوں سے چُن چُن کر آدم خور شیر مارے ہیں۔ اور . . . . " لیکن یہاں ایک بات کا خیال رکھتا ہوں کہ کہیں میری شکاری زندگی اصل عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد میں کچھ اس طرح آگے بڑھتا ہوں۔

"میں مسلسل کئی شیروں کا شکار کرنے کے بعد بہت تھک گیا تھا اور آرام کی غرض سے کچھ دنوں کے لئے ٹمبکٹو آ گیا تھا ـــــ لیکن وہاں پہنچنے کے تیسرے ہی روز مجھے خبر ملی کہ ریاست چکٹائی کے ایک قصبے نکٹائی میں ایک آدم خور شیر نے بڑی دہشت پھیلا رکھی ہے۔ میں فوراً اپنے ملازم سمیت اس جگہ پہنچ گیا جو ٹمبکٹو سے اٹھاون میل دور ہے۔" اپنے اس ملازم کا نام میں نہایت عجیب سا چُن کر رکھتا ہوں۔ مثلاً ٹاکی یا چاکی وغیرہ۔ اور اس کا تعارف کراتے

نے اس کی خوب تعریف کرتا ہوں، مثلاً وہ افریقہ کے چپے چپے سے واقفیت رکھتا تھا۔ اندھیرے میں بھی شیر کی آواز دو میل سے سُن لیتا تھا۔ بو سونگھ کر بتا دیتا تھا کہ یہ شیر ہے یا شیرنی یا بلی۔ پنجوں کے نشان دیکھ کر سمجھ جاتا کہ یہ اُلٹے پاؤں چلنے والا جانور ہے یا سیدھے اس طرح میں خود بڑی مصیبت سے بچ جاتا ہوں۔

"ہاں تو جب میں سہ پہر کے وقت نکٹائی کے قصبے میں پہنچا تو کچھ لوگوں نے مجھے خبر دی کہ میرے پہنچنے سے کچھ ہی دیر قبل گاؤں کے شمال (یا جنوب) میں جو دریا بہتا ہے۔ وہاں اسی آدم خور نے ایک عورت کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس نئی واردات سے پوری بستی کے لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور ظاہر ہے، اس بدنصیب عورت کے رشتہ دار زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی اور وہاں کے لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کرنے شروع کر دیئے تھے — موقعے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے میں فوراً کچھ لوگوں کے ساتھ جائے وقوع پر پہنچا۔ تازہ پنجوں کے نشانات سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ لوگ جسے بیوقوفی سے شیر سمجھ رہے تھے وہ دراصل ایک خوفناک شیرنی تھی۔ میرے ملازم نے مجھے مزید بتایا کہ اس شیرنی کی دُم کٹی ہوئی ہے اور اس کے ایک کان کا نچلا حصّہ بھی غائب ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ ملازم غلطی پر نہیں ہے۔ خون کے دھبے زمین پر اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے لاش کا پتہ لگانے کے لئے اسی وقت دھبوں کے ساتھ ساتھ جانا چاہا لیکن چونکہ شام ہو رہی تھی اور اندھیرا بھی پھیل رہا تھا، اس لئے ہمارے ساتھ کوئی بھی جانے کو تیار نہ تھا۔ ناچار میں اپنے ملازم کے ساتھ ہی روانہ ہو گیا کچھ دور جانے کے بعد دھبے ایک گھنے جنگل کے اندر جا کر غائب ہو جاتے تھے اور چونکہ آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھ رہا تھا اور میں لمبے سفر کے بعد بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے ہم واپس گاؤں آ گئے۔"

ویسے بھی اتنی جلدی شیرنی کا پتہ چل جانے سے داستان میں وہ جان نہیں رہ جاتی تھی۔ کہانی کو اور زیادہ سنسنی خیز بنانا مقصود ہو تو یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ گاؤں واپس

آتے وقت میں نے کسی سائے کو درختوں کے پیچھے دیکھا تھا جو ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ تمام لوگ سانس روکے حیرت سے میری باتیں سُن رہے ہیں۔ لوگوں کا ایسا انہماک تو کسی وعظ میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا میرے لئے یہ لمحہ نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ لوگوں کی آتشِ شوق کو بھڑکانے کے لئے میں نہایت اطمینان سے ایک سگریٹ نکالتا ہوں۔ پھر اسے دو چار بار سگریٹ کے پیکٹ پر تھپ تھپانے کے بعد مُنہ سے لگا لیتا ہوں اور دو تین لمبے لمبے کش لیتا ہوں۔ اس وقت لوگوں کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آخر ترس کھا کر داستان کو طول دینے کی غرض سے کچھ اس قسم کی باتیں کرتا ہوں۔

ہم نے پورے دس دنوں تک اس شیرنی کا انتظار کیا۔ لیکن وہ نہیں آئی جگہ جگہ مچان اور بھینسا بندھوا کر اس کی تاک میں لگے رہے لیکن بے سود۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی پہلے ہی سے اسے خبردار کر دیتا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ شیرنی غضب کی چالاک تھی۔ مزے سے سارے جنگل میں گھومتی لیکن ہماری رائفل کی زد میں بالکل نہ آتی۔ جب اتنے دنوں تک ہم سے کچھ نہ ہو سکا تو لوگوں کا یہ خیال یقین میں بدل گیا کہ وہ شیر نہیں کوئی بھوت ہے۔ اس کے بعد یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بھوت یا شیر نہیں بلکہ شیرنی تھی، میں واقعات کی کڑیوں کو یوں جوڑتا ہوں۔

"وہ رات بالکل تاریک تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صرف چاند کی تھوڑی سی روشنی میں مَیں اپنے ملازم کو دیکھ سکتا تھا جو میرے ساتھ ہی مچان پر تھا اور سو رہا تھا۔ آج بھی جب میں اس رات کا خیال کرتا ہوں تو خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ ہاں کبھی کبھی کوّوں کی کائیں کائیں کرنے کی آواز آجاتی تھی جس کی وجہ سے میرا ملازم گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا تھا۔۔۔میں دو گھنٹے سے رائفل پکڑے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے جھاڑیوں میں اس مزدور کی ادھ کھائی لاش تھی جسے شیرنی نے صبح کے

وقت شکار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لاش کا بقیہ حصہ کھانے ضرور آئے گی۔ کیوں کہ مزدور کا جسم بہت اچھا تھا اور اس کا گوشت یقیناً مزے دار ہوگا۔

یکایک فضا میں ایک عجیب قسم کا تناؤ پیدا ہوگیا۔ ایسے موقعوں پر میری چھٹی حس ہمیشہ میرا ساتھ دیتی ہے۔ مجھے اس پر اپنی رائفل سے زیادہ بھروسہ ہے۔ میں فوراً چوکنا ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا —— اور پھر وہی ہوا جس کا پتہ میری چھٹی حس نے مجھے پہلے ہی دیدیا تھا۔ یعنی وہ شیرنی میری پشت کی طرف سے آہستہ آہستہ۔ . . لیکن وہ شیرنی کہاں۔ وہ تو ایک شیر تھا۔ لَاحَولَ وَلَا قُوّۃ! مجھے تو اس آدم خور شیرنی کی تلاش تھی جو یقیناً شیرنی ہی تھی۔ میں نے شیر کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور وہ کچھ دیر کے بعد جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ اب مجھے کچھ شک ہورہا تھا کہ شاید وہ شیرنی ہی تھی۔ مجھے دیکھنے میں دھوکا ہوا تھا۔ افسوس کہ میرا ملازم سویا ہوا تھا ورنہ . . . لیکن نہیں! میرا خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ میرے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں کچھ آہٹ سی ہوئی اور آخر کار میں نے دیکھ لیا کہ ایک شیرنی نہایت مکاری سے لاش کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بس پھر کیا تھا، میں نے فائر کردیا۔ میری رائفل سے ایک شعلہ نکلا اور شیرنی کی گرج سے سارا جنگل دہل گیا۔ میرا ملازم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور (suspence) پیدا کرنے کو نیچے کود گیا۔ ابھی اس نے دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ زخمی شیرنی نے ایک زوردار جست لگائی اور ملازم کی گردن دبانا ہی چاہتی تھی کہ میں نے دوسرا فائر کرکے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔"

میری اصل داستان یہاں ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن یہاں پر چُپ ہوجانا سخت حماقت ہے۔

"فائر کی آواز سُن کر تمام گاؤں والے ہمارے پاس پہنچ گئے اور مجھے کاندھے پر اُٹھاکر خوشی سے ناچنے لگے۔ آخر میں نے ہی انھیں اس بھوت سے نجات دلائی تھی۔ دوسرے دن اس شیرنی کو اٹھاکر گاؤں لایا گیا تو اس کا وزن چار سو من نکلا اور دُم سے مُنہ تک کی لمبائی چالیس فٹ چار انچ۔"

اگر میرے اس بیان پر کوئی احتجاج کرتا ہے تو بڑی بے اعتنائی سے جواب دیتا ہوں "اجی آپ کیا جانیں۔ وہاں اعشاری نظام بہت پہلے سے رائج ہے اور وہاں ایک فٹ میں دس انچ ہوتے ہیں . . ." اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔ کس کی مجال ہے جو اتنے مستند حوالوں کے بعد بھی منہ کھولے۔

اس کے بعد دور خلاؤں میں تکتے ہوئے داستان اس طرح ختم کر دیتا ہوں۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔ اور اکثر رات کے وقت جب میری نیند ٹوٹ جاتی ہے تو سوچنے لگتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ اس شیرنی کی دُم کٹی ہوئی تھی۔ ایک کان کا نچلا حصہ غائب تھا اور شاید اس کی بینائی بھی کمزور تھی۔ لیکن اس کے جبڑے اور پنجے تو صحیح سلامت تھے . . . پھر وہ آدم خور کیسے بن گئی۔۔؟"

اور سامعین کے دماغ اس سوال میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور میں صاف نکل آتا ہوں۔ کسی اور موقعے پر اسی کہانی کو میں کسی اور عنوان سے روانی کے ساتھ سُنا جاتا ہوں۔ صرف تھوڑے سے ردّ و بدل کی ضرورت پڑتی ہے۔

آپ بھی میرا آزمودہ نسخہ استعمال کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ انشاءاللہ کامیابی ہو گی کیونکہ عام طور سے لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔

تبصرے

"جواہر سے لال تک" نذیر بنارسی۔ ہندی پرچارک پستکالیہ
پشاچ موچن، وارانسی ۱ قیمت مجلد پانچ روپے

گنگ وجمن کے شاعر نذیر بنارسی موجودہ عہد کے قومی شاعروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ نہ فلسفی ہیں نہ سیاست داں نہ عالم ہیں نہ مورخ، بس تعمیر وطن اور حُبِّ وطن کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ ان کے لئے بقول چکبست "خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا ہے"۔ زیر نظر مجموعہ میں نذیر بنارسی کی وہ نظمیں شامل ہیں جو انھوں نے گزشتہ چھ سات سال میں ایسے موضوعات پر لکھی ہیں جن کا تعلق وطن پرستی سے ہے۔ خود ان کا خیال ہے کہ ان نظموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے نظر سے زیادہ عقیدت درکار ہے کیوں کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور اپنے محبوب میں وہ ادائیں دیکھ لیتی ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جہاں شاعر کے والہانہ جوش اور قاری کے درمیان براہِ راست رشتہ قائم ہوتا ہے۔

نذیر بنارسی نے جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری کو قومی زندگی کی علامت قرار دے کر ان کے کارناموں اور ان کی موت کو مختلف انداز میں دیکھا اور سمجھا یا ہے۔ چاہے وہ ہندوستان اور چین کی آویزش ہو یا ہند پاک جنگ، چاہے ہولی اور دیوالی کا تذکرہ ہو یا نہرو اور شاستری کی موت کا۔ نذیر کے جوش وخروش میں، اظہارِ مسرت اور اظہارِ غم میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی۔ اور ایک بنیادی رنگ ان کے تصورات پر چھایا رہتا ہے۔ جب ہمارے سوچنے کا طریقہ جذباتی

ہوتا ہے تو اس کے اظہار میں اور خاص کر ایسے حقائق کے اظہار میں جہاں عمل کے پہلو نکلتے ہیں خطابت کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ نذیر کے یہاں بھی خطابت کی فراوانی ہے۔ اپنے موضوعات اور مقصد اظہار کے نقطہ نظر سے نذیر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ مناسب اور دلکش ہے کتاب نہایت خوبصورت چھپی ہے۔ متعدد پیغامات اور تعارفی مضامین میں نذیر کی قومی شاعری کو سراہنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سمپورنانند، سری پرکاش، فراق گورکھپوری جواد زیدی ہیں۔ اور ڈاکٹر امرت لال عشرت نے ایک سیر حاصل تبصرہ لکھ کر نذیر بنارسی کی نظموں کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔

"رگِ ساز" شاہین غازی پوری پاک کتاب گھر ۲۹ پٹوا ٹولی ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) قیمت پانچ روپے

چند سال قبل کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ شعرا کے مجموعہ کلام افسانہ نگاروں، ناول نویسوں اور نقادوں کے کارناموں کے مقابلہ میں کم شائع ہونے لگے تھے۔ لیکن اب صورت حال یہ ہو کہ جس شاعر نے بھی پچاس ساٹھ نظمیں اور غزلیں لکھ لی ہیں وہ اپنا مجموعہ مرتب کر لیتا ہے۔ اس طرح ہر روز کوئی نہ کوئی مجموعہ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو رطب و یابس دونوں کی فراوانی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

شاہین غازی پوری کا یہ پہلا مجموعہ اس سیلاب میں بھی اپنی جانب متوجہ کرتا ہے کیوں کی ان کی نظموں میں فکر کی تازگی اور غزلوں میں درد شوق کی گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ نئی شاعری کے بعض اسالیب اظہار عجز کی واضح مثال پیش کرتے ہیں۔ لیکن شاہین کے یہاں لذت گفتار کی ترسیل پڑھنے والے تک بھی ہوتی ہے۔ گو غزلوں اور نظموں دونوں میں کہیں کہیں پابندئ راہ و رسم بھی ہے لیکن شاہین نے بہت سی نظموں میں اپنی بات اپنے ہی لہجے میں کہی ہے۔ ہمیں اس مجموعہ کا خیر مقدم کرنا چاہئے

نوائے سیفیہ

(بھوپال نمبر) شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال
سالانہ قیمت درج نہیں ہے۔

یہ سیفیہ کالج کے لئے فخر کی بات ہے کہ وہاں سے ایک اچھے سالانہ مجلّہ کے علاوہ اردو میں ایک اور رسالہ وقتاً فوقتاً نکلتا رہتا ہے۔ جو محض کالج اور طلبہ کی سرگرمیوں کی اشاعت نہیں کرتا بلکہ علمی اور ادبی مضامین بھی شائع کرتا رہتا ہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی جو اِن ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں ہیں، مستقل اس فکر میں رہتے ہیں کہ "نوائے سیفیہ" ایک علمی اور ادبی دستاویز کی طرح محفوظ کر لینے والا رسالہ بن جائے۔ چنانچہ اس بار انھوں نے رسالہ کا بھوپال نمبر شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی دو بھوپال نمبر چھاپ چکے ہیں۔ جس سے وہاں کی تہذیبی اور علمی زندگی کی روایات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نمبر میں کچھ ذاتی تاثرات، کچھ پیغامات، کچھ عقیدت مندانہ اشارے اور کچھ مضامین شامل ہیں۔ نواب صدیق حسن، امیر مینائی، برکت اللہ، شہا مجددی، اچھے صاحب نفیس کے متعلق معلوماتی مضامین، بھوپال کی زندگی کے متعلق دلچسپ تحریریں بڑی خوش اسلوبی سے یکجا کی گئی ہیں۔ سیفیہ کالج کا یہ شعبۂ اردو اس کے لئے مبارکباد کا مستحق ہے۔

کلکتہ اک رباب

سید حرمت الاکرام حلقۂ ترویج ادب
رام باغ مرزاپور قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

اردو شاعری میں شہروں کا تذکرہ تین چار صورتوں میں اکثر آتا رہا ہے۔ سب سے اہم اور واضح شکل تو وہ ہے جو شہر آشوبوں کی روایت بنی۔ اس کے علاوہ بعض شہروں کے تذکرے مثنویوں میں آئے۔ ان کا مقصد محض بیانیہ تھا، تیسری شکل وہ تھی جس میں کسی شہر ہی کو موضوع بنا کر اُس کے تاریخی اور جغرافیائی پہلوؤں کی عکاسی کی گئی۔ جدید شاعری میں شہر کا ذکر تمدّن کے اس دیو پیکر درندے کی طرح کیا جا رہا ہے جو افراد کو نگل جانے کی فکر میں ہے اور اپنی ہما ہمی سے سکون کی ہر شکل کا دشمن ہے۔ حرمت الاکرام نے اپنے پچاس بندوں کے مسدّس میں ان تمام روایات کو ملایا بھی ہے اور اپنی ذاتی اور شخصی زندگی کو کلکتہ کے اس آئینہ خانہ میں مرکزی جگہ دے کر ایک نئی کیفیت پیدا کی ہے۔

"تنقیدی مطالعے" پروفیسر انور سیوانی   قیمت ۳ روپے
عبدالباری آسی اکاڈمی۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

زیر نظر کتاب انور سیوانی کے نو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین عام طور سے مختصر اور توضیحی ہیں اور اس سطح کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں جو طلبہ کے لئے اُنھوں نے معین کی ہے۔

اپنے دیباچہ میں پروفیسر انور نے خیالات کے متوازن اور واضح ہونے پر بہت زور دیا ہے اور تنقید سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ "عام سمجھداری" کے قریب ہو۔ عام سمجھداری کی تشریح اُنھوں نے یہ کی ہے کہ اس کا پڑھنا ذہنوں پر بار نہ ہو بلکہ عام قاری کے لئے ذہنی تسکین کا سامان فراہم کرے۔ اس حیثیت سے یہ مضامین تعارفی انداز رکھتے ہیں اور مختصر الفاظ میں بعض شاعروں اور ادیبوں یا بعض کتابوں سے متعارف کراتے ہیں۔ پروفیسر انور کے انداز میں سادگی ہے۔ عام پڑھنے والا ان میں وہ گہرائی نہیں پائے گا۔ جو ادب و شعر کی فنی گتھیاں سلجھاتی اور ذوق مطالعہ کو مہمیز کرتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ مضامین اس ضرورت کو پورا کریں گے جس کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن وہ سوالات نہیں پیدا کریں گے جن سے ذہن نئے افق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔

"گل صحرا" طالب جے پوری
۸ ار ہیسٹنگز روڈ الہ آباد   قیمت دو روپے

طالب جے پوری کا کلام عام طور سے نہ تو رسائل میں شائع ہوتا اور نہ مشاعروں میں ان کی شرکت ہوتی ہے لیکن چھوٹی چھوٹی ادبی صحبتوں میں ان کا کلام شوق سے سُنا جاتا ہے۔ طالب جے پوری خاموش، کم گو، کم آمیز، متین اور غیر نمائشی بزرگ ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں میں بھی وہ اُنھیں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں جن کے یہاں نمائش کم اور سنجیدگی زیادہ ہے۔ یہی کیفیت ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ شائستگی اور انکسار کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ غزل کبھی کبھی اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان کا ذوق پاکیزہ ہے اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے یہاں فکر کے پہلو نمایاں رہیں۔ "گل صحرا" طالب جے پوری کا منتخب کلام ہے۔ جسے خود اُنھوں نے شائع کیا ہے۔

بیکسی ارض وطن سے حرمت الاکرام کو کلکتہ لے گئی وہاں اُنھیں دھوپ سے چھاؤں میں پہونچ جانے کا احساس ہوا۔ لیکن کلکتہ ایک بڑا بے رحم شہر ہے۔ مہمان نوازی بھی کرتا ہے اور فرش خاک پر سلا کر امراض کا شکار بھی بناتا ہے۔ ہُن بھی برسا دیتا ہے اور فقیر بنا کر گلیوں میں پھراتا بھی ہے۔ جلووں میں کھو جانے کا موقع بھی دیتا ہے اور تماشائی بن کر محض دور سے دیکھتے رہنے کی خلش بھی پیدا کرتا ہے اس کا تمدن مغربی سانچے میں ڈھلنے کے باوجود ہندوستانی ہے۔ اس کلکتہ نے شاعر کی قوت تخلیق کو مہمیز کیا اور اپنے جلال وجمال، حسن قبح کا رنگا رنگ پہلو اس کے سامنے پیش کر دیا۔ "کلکتہ اک باب" اسی تخلیق خاطر کا نتیجہ ہے۔ حرمت الاکرام کے فن میں پختگی، انداز بیان میں تازگی اور اظہار میں نیا حسن ہے۔ جس نے کلکتہ کو ایک کردار۔ ایک شخصیت، ایک زندہ اور متحرک خطہ ارض بنا کر پیش کیا ہے۔ اردو شاعری میں اس نظم کی اہمیت ہے۔

"بھوپال میں غزل" مرتبہ دلکش ساگری ترقی بک ڈپو ابراہیم پورہ بھوپال قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

شاید بہت سے لوگ اس بات کو پسند نہ کریں کہ ہر بڑے چھوٹے مرکز ادب کی داستان الگ الگ کہی جائے کیوں کہ اس سے ادب کی وسعت اور ہمہ گیری کا احساس مقامیت اور محدود عصبیت میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ پھر بھی مطالعہ کی آسانی، ادبی فضا کے احساس اور شاعرانہ سرگرمیوں کی تاریخ کبھی کبھی اس تقسیم کو بھی حق بجانب قرار دے سکتی ہے۔ دلکش ساگری نے بھوپال کے نئے شعرا میں سے پچیس شاعروں کی منتخب غزلیں ایک جلد میں پیش کی ہیں۔ انتخاب ہمیشہ انفرادی پسند کی چیز بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ صرف یہی شعرا کیوں اور ان کی یہی غزلیں کیوں؟ تو اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انتخاب کنندہ نے انھیں کو اہم سمجھا۔ یہ تو واضح ہے کہ مرتب نے اپنا دائرہ انتخاب وسیع کر رکھا ہے لیکن اختر سعید۔ تاج۔ کیف۔ مقصود عمرانی۔ ارشد صدیقی کے ایسے کلام کا خیال آتا ہے جو غزل ہی کے نقطہ نظر سے اس مجموعہ میں شامل کلام سے بہتر تھا۔ نعیم احمد نے ایک دلچسپ تبصرہ لکھا ہے اور قدیم وجدید غزل کے لیے چوٹی کا جوڑا اور نابلان کی بھیگی ساری

کی علامتوں کی مدد سے دونوں کے مزاج کا فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ دونوں لفظ چند صفحات میں تقریباً سو سو بار استعمال ہوئے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے ہیں۔ پھر بھی تبصرہ دلچسپ اور معنی خیز ہے اور انتخاب تقریباً نمائندہ۔

"کل کی باتیں" رام لعل۔ کتاب پبلیشرز
چوک لکھنؤ ۳ قیمت پانچ روپے

یہ رام لعل کے افسانوں کا آٹھواں مجموعہ ہے جن میں سے غالباً پانچ گذشتہ چھ سات سال کے اندر شائع ہوئے ہیں۔ رام لعل برابر خوب سے خوب تر کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانوں میں جو بات زیادہ نمایاں ہے وہ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اور ڈرامائی خاتمہ ہے۔ نفسیاتی کشاکش کی تفصیلات تو اکثر افسانہ نگار پیش کرتے ہیں اور کرداروں کے ذہن یا جذباتی عمل کو ظاہر کرنے کے لئے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن رام لعل نے اس عمل کو لاشعور ہی نہیں شعوری سطح پر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اُنھوں نے زندگی کے اہم لمحات کو قید کیا ہے، وہ لمحے جو با معنی ہیں اور زندگی کے ظاہر و باطن کو دور تک معنی خیز بناتے ہیں۔ رام لعل نے مسلسل جد و جہد اور غور و فکر کی روشنی میں افسانوں میں جو تجربے کئے ہیں ان سے کہانی کی دلچسپی اور تاثر میں اضافہ ہوا ہے۔ اُنھوں نے کہیں محض تجربے کے لئے ہیئت کو توڑا مروڑا نہیں ہے۔ بلکہ اسلوب کی تازگی سے اس نئے پن کا اظہار کیا ہے جو وقت کے ادبی رنگ سے ہم آہنگ ہے۔

— سید احتشام حسین

تنقید اور احتساب وزیر آغا : جدید ناشرین، چوک لاہور
صفحات ۳۲۵ قیمت ۵ روپے

"تنقید اور احتساب"، "نظم جدید کی کروٹیں" اور "اردو شاعری کا مزاج" کے مصنف ڈاکٹر وزیر آغا کی تازہ ترین تصنیف ہے، جسے جدید ناشرین لاہور نے اتنے سلیقہ سے شائع کیا ہے کہ کتاب کو بار بار پڑھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو بھی جی چاہتا ہے۔

"تنقید اور احتساب" مصنف کے ان چوبیس مضامین کا مجموعہ ہے جن میں زیادہ تر مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر پڑھنے والوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اردو ادب کے جدید قاری کو عام طور پر یہ احساس ستاتا رہا ہے کہ ہمارے نقادوں کے پاس عموماً ان کا کوئی اپنا نظریۂ تنقید نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی کے پاس کوئی ٹوٹا پھوٹا نظریہ ہوتا بھی ہے تو وہ خوف فسادِ خلق سے اتنا سہما رہتا ہے کہ اس نظریہ کو اپنے تنقیدی مضامین میں کھل کر برتنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وزیر آغا کا دم یقیناً بہت غنیمت ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی نظریہ کو "فن زمینی اور آسمانی عناصر کے امتزاج سے جنم لیتا ہے" اپنے سبھی تنقیدی مضامین میں عملی طور پر برتا ہے اور عام طور پر ایسا کرنے میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

دوسری خصوصیت جو انھیں اپنے ہم عصر نقادوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے اظہار کا توازن۔ ان دنوں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ نئے نقاد ہوں یا پرانے، عموماً اپنی بات قاری کو (Irritate) کئے بغیر نہیں کہہ سکتے۔ وزیر آغا خواہ شمس آغا کے افسانوں پر بحث کریں یا ابلاغ کے مسئلہ پر، توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس توازن کی بنیاد کو وہ استدلال سے مستحکم کرتے ہیں جو ضروری طور پر ہمیشہ اور ہر شخص کے لئے قابل قبول نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں بلراج کومل — ایک نئی جہت، اردو افسانے کے تین دور، اور ادب کی پرکھ جیسے مضامین مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ان مضامین کو پڑھ کر قاری کا ذہن جس طرح (Provoke) ہوتا ہے اور بہت کچھ (اپنے طور پر) سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، وہ وزیر آغا کی تنقید کی جدت اور قوت کا زندہ ثبوت ہے۔ مجموعی طور پر چونکہ ان مضامین کی مدد کے بغیر عصری ادب کو پوری طرح سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہیں ہے اس لئے ادب کے ہر قاری کو اس کتاب کا مطالعہ کر رکھنا چاہئے تاکہ وقت ضرورت وہ ہمی نقادوں کو سبق پڑھا سکے اور ادب کے معاملہ کو آگے بڑھا سکے۔

فضیل جعفری

زردے کے موجد

احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ

چوک لکھنؤ

کا

تیار کردہ

زردہ ــــ قوام ــــ گولی

پان کی جان ہے

اس کی لذت شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے

احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ

ہیڈ آفس چوک لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۲۱۷

I

کارخانہ عبدالعزیز روڈ لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۹۴۴



قدرتی تیل

کارخانہ دار الصحت کا ایک بےنظیر تحفہ



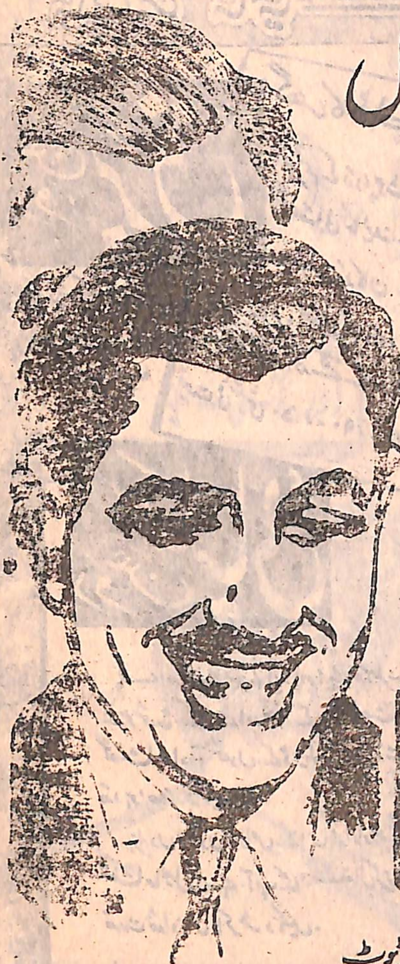
جسکو خرید کر

آپ

خاندان کے ہر فرد کو بیک وقت
ان مرضوں میں فوری فائدہ
پہونچا سکتے ہیں

جسمانی درد، زخم، چوٹ
موچ، کٹنے، جلنے اور
بچوں کے سردی لگجانے
میں مفید
ہے

دار الصحت [illegible]



وسمول

سفید بالوں کو چمکیلا سیاہ بناتا ہے

"وسمول" سائنٹیفک طریقوں سے بنایا ہوا بالوں کو صحیح معنوں میں سیاہ کرنے والا۔ بالوں کو تقویت پہنچانے والا خوشبودار ہیئر ڈریسنگ ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود "وسمول" کی قیمت کسی بھی اچھے ہیئر آئل سے زیادہ نہیں ہے۔

وسمول

بالوں کو یقینی طور پر سیاہ اور چمکیلا بناتا ہے

دو شکل میں ملتا ہے:
رقیق ہیئر آئل کی شکل میں اور پومیڈ کی شکل میں۔ سب ہی دوا فروشوں کے یہاں اور اسٹورس میں ملتا ہے۔





ہائی جینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲، بمبئی نمبر ۱

نادر و نایاب نسخے

گھر کا ڈاکٹر

ہر قسم کے درد، چوٹ۔ موچ۔ ورم۔ زخم۔ درد سر۔ درد چشم
اعصابی تکالیف۔ بچھو بھڑ کے ڈنک۔ درد کمر۔ خنزیر
پیٹھوا۔ درد کان درد دانت۔ درد پسلی۔ شوکھا روگ
نزلہ۔ زکام۔ گھٹنوں کا درد۔ ورم طحال۔ درد گردہ۔ درد سینہ۔ اعصابی کمزوری
نمونیہ۔ جلنے اور کٹنے کے لئے بہت مجرب اور زود اثر ثابت ہوا ہے۔
قیمت فی شیشی ۵۰ء - ۹۰ء - ۱ء۶۵ - ۳ء۰۰ روپے

روغن برق رجسٹرڈ

یونین کیمیکل ورکس کی کامیاب ایجاد

روغن سملبائی

پورے اور آدھے سر کے درد اور ایسے درد سر کے لئے جو سورج کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا ہو اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں شدت کا درد ہو حد درجہ مفید ہے۔

ہزاروں لاکھوں اشخاص نے اس خداداد نعمت سے شفا حاصل کی ہے۔ آپ بھی استعمال کریں اور قدرت خداوندی کا کرشمہ دیکھیں۔

قیمت فی شیشی ۱ء۰۰ - ۱ء۷۵ - ۳ء۲۵ روپے

لاکھوں مریض شفایاب ہو چکے ہیں

قمرالدین بدرالدین پرفیومرس
چوک الہ آباد

یہ میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اِن کی شادی ہوئے، دو برس ہونے کو آئے ہیں — اور جب اُن سے یہ پُوچھا گیا کہ بچوں کے بارے میں اُن کا کیا خیال ہے، تو بیوی نے کہا "ابھی ہم اِس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ابھی ہمیں بچہ نہیں چاہیے۔ بچوں کو پیار، وقت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر اُن پر پیسے بھی کتنے خرچ ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے اِن ساری سہولتوں سے محروم رہیں!"

خاوند نے کہا: "اور ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم کم سے کم کچھ عرصہ تو اُلجھنوں اور گھریلو جھنجھٹوں میں پڑے بغیر ہنسی خوشی دِن گزاریں۔ اِسی لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے یہاں



پہلا بچہ جبھی ہوگا جب ہم اس کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے پُوری طرح تیار پائیں گے — ہاں، ہم پہلا پیار بڑے خُوش ہیں"

یہ خُوش ہیں —

اور آپ ؟ •



زیرِ طبع کتابیں

میرے خیال میں	(تنقیدی مضامین)	نظیر صدیقی
نجات سے پہلے	(شعری مجموعہ)	قاضی سلیم
چٹان اور پانی	(مضامین)	فضیل جعفری
الفاظ کی خوشبو	(شعری مجموعہ)	حامد حسین حامد
کھردری انگلیوں کی جنبش	(شاعری)	انتخاب سیّد
نئی کتاب	(شعری انتخاب)	مرتب: ساحل مانکپوری
چاروں اور	(شعری انتخاب)	مرتبین: شاہ کبیر، مدحت الاختر
مدھوبن	(شعری مجموعہ)	محمود عشقی
برگِ آوارہ	(شعری مجموعہ)	مقبول سلیم

مکتبہ شاہکار سے آپ مندرجہ ذیل کتابوں کے علاوہ اپنی پسند کی ہر کتاب طلب فرما سکتے ہیں۔ شاہکار کے خریداروں کو خاص رعائت دی جائے گی۔

نثر و غزل دستہ	(کلیات نثر و نظم، شاد عارفی)	مرتب: مظفر حنفی	۸/-
اینٹ کا جواب	(افسانے)	"	۴/-
عقبار نظر	(مضامین)	احتشام حسین	۴/۵۰
کل کی باتیں	(افسانے)	رام لعل	۵/-
مجازی جہات اور شاعری	(تنقید)	منظر سلیم	۴/۵۰
بہار کا بہلاوہ	(ناول)	علاء الدین آزاد	۴/-
سپہ سالار خلجی	(ناول)	مائل ملیح آبادی	۵/-
دارا شکوہ	(ناول)	قاضی عبدالستار	۴/۵۰
چاندنی اساڑھ کی	(مجموعہ کلام)	راج نرائن راز	۳/-
نور فردا	(مجموعہ کلام)	عتیق احمد عتیق	۳/-
غزل انسائیکلوپیڈیا	(شعری انتخاب)	ذکی کاکوروی۔ ایم۔ اے (علیگ)	۵/-
ملا نصیر الدین کے لطیفے	(مزاحیہ)	احمد جمال پاشا	۴/-
فن لطیفہ گوئی	(پھڑکتے لطیفے)	"	۳/-
ہجویات میر	(انتخاب ہجویات)	"	۳/۵۰
شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت	(تنقید)	"	۳/-
ستم ایجاد	(طنز و مزاح)	"	۴/۵۰
تنقیدی مطالعہ	(تنقید)	پروفیسر انور سیوانی	۳/-
بھوپال میں غزل	(شعری انتخاب)	مرتب: دلکش ساگری	۲/۵۰

آپ کی غزلیں	(شعری انتخاب)	مرتب :	ساحل مانکپوری	۲/-
افکارِ خوشتر	(مجموعہ کلام)		ڈاکٹر ممتاز خوشتر	۱۰/۵۰
نقش جاوداں	"		پرنس نقی علی ثاقب	۳/-
گل افشانیاں	(نعتیہ کلام)		ڈاکٹر خوشتر	۱/-
روشنی کے پھول	(رپورتاژ)		اکرام جاوید	۴/-
عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک	(")		عاتق شاہ	۱/-
انتخاب کلام فراق	(انتخاب کلام)	مرتبہ :	خلیل الرحمن اعظمی	۱/-
یاس یگانہ چنگیزی	(تنقید)		راہی معصوم رضا	۶/-
چار دل چار راہیں	(ناول)		خواجہ احمد عباس	۳/۵۰

No. 6 Regd. No L/959

SHAHKAR
(Literary Urdu Digest)
ALLAHABAD.

...at Hind Printing Press, 1, Shah Ajmal Lane, Allahabad-3.